۲۸ فروری ۱۹۷۱ء

ہفت روزہ

لیل و نہار

ولیکا

کے

کارخانے

میں جب

پولیس

داخل ہوئی



ملز

پر

قبضے

کی

ولولہ

انگیز

کہانی

تفصیلات
صفحہ ۱۱ پر
ملاحظہ کیجئے

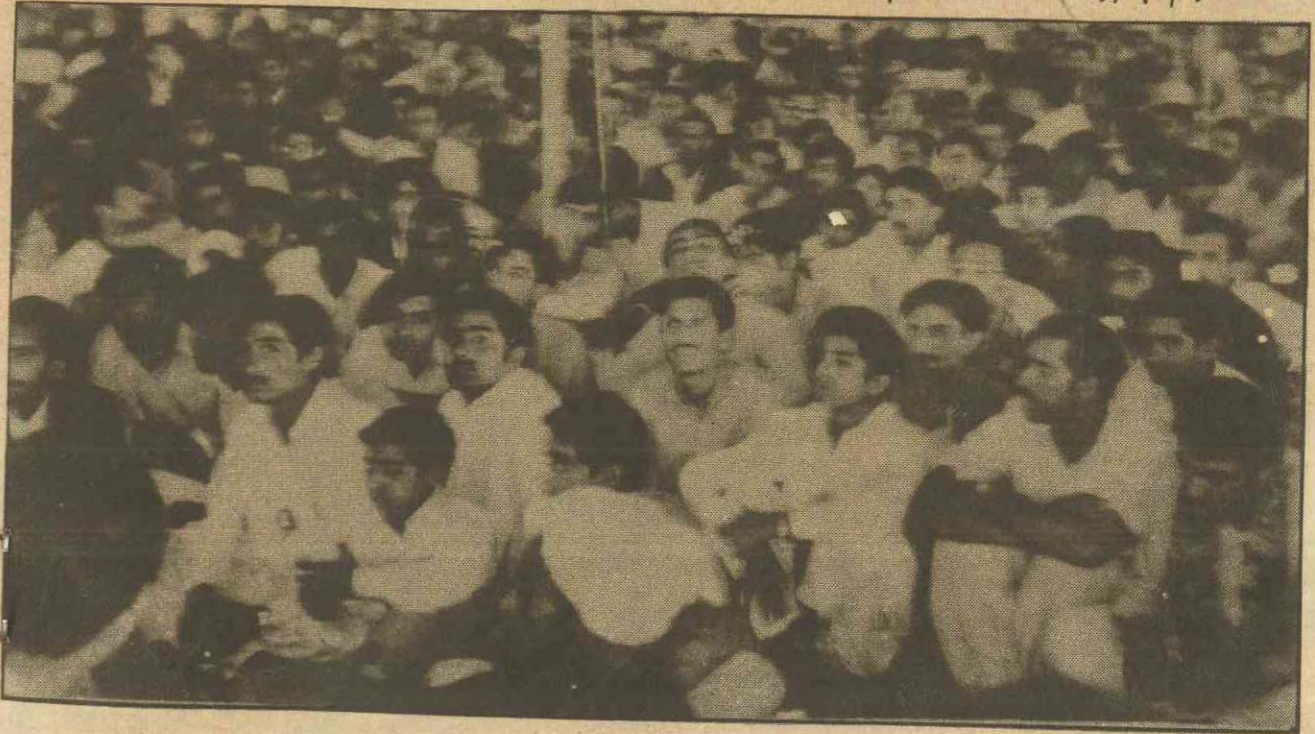
قیمت مغربی پاکستان میں ۶۰ پیسے، مشرقی پاکستان میں ۷۵ پیسے۔

حیدرآباد میں سندھی زبان کے کنونشن ۱۴ فروری کی رُوداد — ایک عظیم اجتماع، جس میں کسی اردو اخبار کا کوئی نمائندہ موجود نہ تھا، کیونکہ مدعو نہ تھا

—— رپورٹ صفحہ ۳۹ پر ملاحظہ کیجئے۔



طالب علم رہنما مہر حسین شاہ، ہاری لیڈر جام ساقی اور کنونشن کی اوّلین نشست کے صدر مولانا عبدالحق ربانی اجتماع سے خطاب کر رہے ہیں



سندھی زبان کے کنونشن میں اجتماع کا ایک منظر

ہفت روزہ کراچی

لیل و نہار

جلد ۲ | ۲۲ تا ۲۸ فروری ۱۹۷۱ء | شمارہ ۸

ادارہ تحریر

فیض احمد فیض ——— حسن عابدی

امین مغل لاہور ——— احمد الیاس ڈھاکہ

فون نمبر ——— ۴۱۷۴۹۰

قیمت

مغربی پاکستان میں ——— ۶۰ پیسے

مشرقی پاکستان میں ——— ۷۵ پیسے

گوادر ریسنی میں ——— ۷۰ پیسے

برطانیہ میں ——— ۲ شلنگ ۱۴ پنس

پوسٹ بکس ۳۱۷۸ کراچی ۲۹

تدبّر کا امتحان

صدرِ مملکت جنرل یحییٰ خاں کے اس اعلان کے بعد کہ مجلسِ دستور ساز کا اجلاس ۳ مارچ سے شروع ہوگا یہ اُمید بندھی تھی کہ پاکستان کو پہلی بار ایک جمہوری آئین کے تحت زندہ رہنے اور ترقی کرنے کا موقع ملے گا۔ لیکن شیخ مجیب الرحمان کی طرف سے عوامی لیگ کے چھ نکات پر مسلسل اصرار اور اب مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کے اسمبلی میں شرکت سے انکار کی وجہ سے سیاسی بحران اس قدر بڑھ گیا ہے کہ اگر عوامی لیگ نے اپنے طرزِ عمل میں لچک پیدا نہ کی تو عوام کی خوشحالی اور پاکستان کی تعمیر کے جو وعدے کئے گئے تھے وہ ایفا نہ ہوسکیں گے اور نہ ملک کو مارشل لاء اور افسر شاہی سے نجات مل سکے گی۔

قومی اسمبلی کے انتخابات کے بعد ہم نے عوامی لیگ اور پیپلز پارٹی کو ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہوئے گذارش پیش کی تھی کہ ان جماعتوں کے رہنماؤں کو اب جماعتی سطح کے بجائے قومی سطح پر سوچنا چاہیئے اور صوبائی حدود سے نکل کر ایسا موقف اختیار کرنا چاہیئے جو پورے ملک کے لئے مفید ہو۔ ہم نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ عوام کے مسائل خواہ وہ مشرقی خطّے کے ہوں یا مغربی خطّے کے یکساں ہیں۔ مشرقی پاکستان کے عوام کو اگر شکایت ہوسکتی ہے تو سرمایہ دار طبقہ اور افسر شاہی سے نہ کہ مغربی پاکستان کے لوگوں سے۔ اور چونکہ عوامی لیگ اور پیپلز پارٹی دونوں جماعتیں سوشلزم سے وفاداری کا دم بھرتی ہیں لہٰذا ان کے درمیان سمجھوتہ بڑی آسانی سے ہوسکتا ہے۔ افسوس ہے کہ ہماری یہ آرزو پوری ہوتی نظر نہیں آتی۔

یہ درست ہے کہ عوامی لیگ کو اسمبلی میں غالب اکثریت حاصل ہے اور پارلیمانی جمہوریت کی رُو سے وہ آئین کا مسودہ اسمبلی میں پیش کرنے اور اُسے منوانے کا حق رکھتی ہے لیکن ہمارے ملک کی جغرافیائی پوزیشن ایسی ہے کہ اگر آئین میں مشرقی پاکستان کے ساتھ ساتھ مغربی پاکستان کے مخصوص حالات اور تقاضوں کا خیال نہ رکھا گیا تو اس قسم کے آئین سے مغربی پاکستان میں اُلجھنیں پیدا ہوسکتی ہیں۔ اگر شیخ مجیب الرحمان فقط مشرقی پاکستان کے لئے آئین بنا رہے ہوتے تو پھر اُن کی جماعت کو اختیار تھا کہ خواہ اس کی بنیاد چھ نکات پر رکھے یا چھپن نکات پر لیکن آئین پورے ملک کے لئے وضع ہونا ہے لہٰذا اسے جماعتی نہیں بلکہ قومی نقطۂ نظر سے تیار کرنا ہوگا۔ مگر عوامی لیگ کے رہنماؤں کا کہنا ہے کہ ہم چھ نکات کی بنیاد پر الیکشن جیتے ہیں لہٰذا ہم آئین بھی اسی بنیاد پر وضع کریں گے جس کا جی چاہے قبول کرے جس کا جی چاہے قبول نہ کرے۔

گزشتہ تئیس برس میں قومی سیاست، معیشت اور اقتدار پر مغربی پاکستان کے حکمراں طبقے کو بالادستی حاصل رہی اور مشرقی پاکستان کے اربابِ سیاست کو اس میں بہت کم حصّہ ملا۔ عوامی لیگ کے چھ نکات اور انتخابات میں شیخ مجیب الرحمان کی جیت دونوں اُس رنجش اور خفگی کا اظہار ہیں جو مشرقی پاکستان میں مغربی پاکستان کے خلاف اس صورتحال سے پیدا ہوئی اور یہ جذبات اب وہاں کے سیاستداں طبقے تک محدود نہیں، عوام کے دلوں میں بھی گھر کر چکے ہیں۔ اب اگر اسی نوع کا یک طرفہ اور تحکمانہ رَوّیہ مشرقی پاکستان کی اکثریتی جماعت نے اختیار کیا تو مغربی پاکستان کے عوام میں بھی اسی نوع کا رَدِّ عمل ہوگا حالانکہ اس وقت تک یہاں کے اربابِ سیاست یا اہلِ اقتدار کی رَوِش جو بھی ہو مغربی پاکستان

کے عوام میں اپنے مشرقی پاکستانی ہم وطنوں کے خلاف نفرت یا کدورت کے جذبات کا شائبہ تک موجود نہیں، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ دونوں جانب کے عوام میں منافرت، اور مغائرت کی خلیج گہری ہوتی جائے گی جس سے مفاد پرست اور استحصال پسند عناصر مزید فائدہ اٹھائیں گے اور نہ صرف ملکی وحدت اور سالمیت کو خطرات درپیش ہوں گے بلکہ انکے مصائب آلام میں اور اضافہ ہوگا۔

عوامی لیگ کی اس ہٹ دھرمی کے جواب میں مسٹر بھٹو نے جو موقف اختیار کیا ہے اُس سے آئینی گتھی سلجھنے کے بجائے اور اُلجھ گئی ہے۔ انہوں نے پشاور کی پریس کانفرنس میں چھ نکات پر تبصرہ کرتے ہوئے انکشاف کیا کہ میری جماعت نے دو نکات تو منظور کر لئے تھے اور بقیہ چار نکات کے بارے میں عوامی لیگ سے گفتگو کی جا سکتی تھی لیکن شیخ مجیب الرحمان کو تو ان نکات پر سرے سے کوئی ترمیم یا اصلاح منظور نہیں ہے۔ ایسی صورت میں اسمبلی میں پیپلز پارٹی کی شرکت بے سود ہوگی۔ اور جب تک عوامی لیگ یہ ضمانت نہ دے کہ وہ ہمارے نقطۂ نظر پر ہمدردی سے غور کرے گی ہم ڈھاکے نہ جائیں گے۔

لیکن مسٹر بھٹو نے شرکت نہ کرنے کے حق میں جو دوسری دلیلیں دی ہیں اُن سے کُلی طور پر اتفاق کرنا مشکل ہے۔ مثلاً انہوں نے فرمایا کہ ہماری جماعت کے نمائندے ڈھاکے میں زیادہ دن قیام نہیں کر سکتے کیونکہ وہ کام کاجی لوگ ہیں اور یہ کہ مغربی پاکستان کو ہندوستانی حملے کا خطرہ ہے لہٰذا ہم وطن سے اتنی دور جا کر اپنے آپ کو پھنسا نہیں سکتے۔ مسٹر بھٹو زورِ بیان میں یہ بھول گئے کہ مشرقی پاکستان کے نمائندے بھی بالکل یہی دلیلیں اسلام آباد کے خلاف دے سکتے ہیں۔ اب اگر مشرقی پاکستان کے نمائندے مغربی پاکستان جانے پر آمادہ نہ ہوں اور مغربی پاکستان کے نمائندے مشرقی پاکستان جانے پر معترض ہوں تو خدارا ہمیں بتایئے کہ قومی اسمبلی کا اجلاس کہاں ہو۔ آسمان پر یا زیرِ زمین۔ رہ گیا ہندوستان کے حملے کا خطرہ، سو اگر کوئی حقیقت ہے تو یہ خطرہ پورے پاکستان کو ہوگا مغربی پاکستان کی تخصیص کیا معنی رکھتی ہے۔ بھٹو صاحب نے یہ تخصیص کر کے اُن عناصر کے الزام کو قبول کر لیا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ مغربی پاکستان کے لیڈر مشرقی پاکستان کو پاکستان کا دوسرا بازو نہیں بلکہ اپنی نوآبادی سمجھتے ہیں۔

ہمیں اب تک یقین ہے کہ عوامی لیگ اور پیپلز پارٹی دونوں کو پاکستان کی وحدت اور سالمیت عزیز ہے۔ نہ عوامی لیگ مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان سے الگ کرنے کی آرزو مند ہے اور نہ پیپلز پارٹی مغربی پاکستان کو مشرقی پاکستان سے الگ کرنا چاہتی ہے۔ لیکن اگر دونوں جماعتوں کو عوام کی فلاح و بہبود منظور ہے، تو تدبر اور دانشمندی کا تقاضہ یہی ہے کہ دونوں جماعتوں کے رہنما اپنے طرزِ عمل پر نظرِ ثانی کریں اور فصل کے بجائے قربت کی راہیں نکالیں۔

پاکستان کے عوام نے عوامی لیگ اور پیپلز پارٹی کے نمائندوں کو اس لئے چنا تھا کہ یہ حضرات سر جوڑ کر بیٹھیں اور ملک کے لئے ایک ایسا آئین وضع کریں جس کی بنیاد عوام کے مفاد پر ہو۔ اگر نمائندوں نے یہ فرضِ منصبی پورا نہ کیا اور پرانے لیڈروں کی طرح ٹال مٹول کرتے رہے یا اپنے صوبائی اور جماعتی مفاد کو قومی مفاد پر فوقیت دی تو تاریخ انہیں کبھی معاف نہ کرے گی اور ان کا بھی وہی حشر ہوگا جو ان کے پیش روؤں کا ہوا۔

ہمارے قومی رہنماؤں کو ہر مسئلے کو اپنے ذاتی وقار کا مسئلہ بنانے کے بجائے ہر قدم اٹھانے سے پیشتر بڑی سنجیدگی اور ذمہ داری سے یہ سوچنا چاہیئے کہ اُن کے طرزِ عمل سے جمہوری قوتوں کو فروغ ہوگا یا رجعت پرستوں کی طاقت بڑھے گی۔ عوام کا فائدہ ہوگا یا عوام کے دشمنوں کے ہاتھ مضبوط ہوں گے۔ اس پہلو سے غور کیا جائے تو معمولی سمجھ کا آدمی بھی اس نتیجے پر پہنچے گا کہ آئینی بحران اور تعطل سے وہی عناصر خوش ہوں گے جو ۲۳ سال سے جمہوری قدروں کو پامال کر رہے ہیں اور آج بھی اسی کوشش میں ہیں کہ جمہوریت کا نازک پودا یہاں جڑ پکڑنے نہ پائے۔ کیا شیخ مجیب الرحمان اور مسٹر بھٹو ملک کے دشمنوں کو اسکی اجازت دیں گے۔



یہ لاٹھی گولی کی سرکار کب تک؟

پولیس کی روش اس وقت تک نہیں بدلے گی، جب تک کوئی نمائندہ جمہوری حکومت عوام کی امنگوں کے مطابق انتظامیہ کے سبھی شعبوں میں انقلابی تبدیلیوں کو رواج نہ دے گی۔

کراچی میں پیپلز پارٹی کے پُرامن جلوس پر پولیس نے لاٹھی چارج کر دیا۔ پارٹی کے چند ممتاز کارکن جن میں قومی اسمبلی کے ارکان بھی شامل ہیں، پولیس کی اندھا دھند لٹھ بازی سے زخمی ہو گئے۔ زخمی ہونے والوں میں حسبِ معمول اخباروں کے فوٹوگرافر بھی تھے، جو ایسے موقعوں پر پولیس کی شقاوت اور غیر ذمہ دارانہ روش کا دستاویزی ثبوت، جیتی جاگتی تصویروں میں محفوظ کرلیا کرتے ہیں اور اسی لئے سب سے زیادہ ہدفِ انتقام وہی بنتے ہیں۔

یہ کراچی میں تین دن کے اندر اندر پولیس کے سنگدلانہ طرزِ عمل کی دوسری مثال تھی۔ اس سے پہلے انہوں نے ولیکا ملز پر دھاوا بولا، مِل کا گیٹ توڑ کر اندر گھسے، پہلے آنسو گیس کے گولوں کی بارش کی اور پھر ہزاروں مزدوروں کو نہایت بیدردی سے مار پیٹا۔ سینکڑوں مزدور گرفتار ہوئے قید میں ان پر کیا گزرے گی اور ان کے بال بچّوں پر کیا ستم ٹوٹے گا، یہ ایک الگ داستان ہے۔

پیپلز پارٹی کے جلوس پر پولیس کے بہیمانہ تشدّد کا سب سے دل شکن پہلو یہ ہے کہ ایک اطلاع کے مطابق موقع پر موجود مجسٹریٹ نے خود بھی اس کارروائی پر حیرت کا اظہار کیا، کیونکہ اُن کے خیال میں اسکی ضرورت ہی نہ تھی۔ سوال یہ ہے کہ پھر کس کے ایما سے یہ کارروائی انجام کو پہنچی؟

ہمیں معلوم ہے کہ پولیس کو اپنے روّیے میں تبدیلی کا مشورہ اتنی بار دیا جا چکا ہے اور اسکی روش پر احتجاج اتنی بار کیا جا چکا ہے کہ اب یہ سارا عمل محض رسمی بن کر رہ گیا ہے پولیس وہی کرے گی جو اب تک کرتی آئی ہے، لاٹھی چارج آئندہ بھی ہوں گے۔ مزدوروں پر، محنت کشوں اور طالب علموں پر، صحافیوں اور دانش وروں پر، جمہوری کارکنوں اور رہنماؤں پر آنسو گیس، لاٹھی چارج، گولی اور سنگین کے حربے آئندہ بھی آزمائے جائیں گے، اور پولیس کی روش اس وقت تک نہ بدلے گی، جب تک کوئی نمائندہ جمہوری حکومت، عوام کی اُمنگوں کے مطابق انتظامیہ کے سبھی شعبوں میں انقلابی تبدیلیوں کو رواج نہ دے گی، جب تک سرکاری ملازموں کا نقطۂ نظر، بنیادی طور پر نہ بدلے گا۔ اور وُہ حکومت کرنے کی بجائے خدمت کرنے کو اپنا مطمحِ نظر نہیں بنائیں گے۔

جو لوگ عوام سے نمائندگی کی سند لے کر اسمبلیوں کے لئے منتخب ہوئے ہیں، اگر وُہ دُوسرے عوامی مسائل کی طرح، جمہوری آزادیوں کے مسئلہ پر بھی اپنی کمیٹیاں بنا کر حکومت کے سامنے تجویزیں رکھیں اور ان کو منوانے کے لئے رائے عامہ کو ساتھ لے کر آگے بڑھیں تو پولیس کی روش میں بھی بنیادی نہ سہی، لیکن نمایاں تبدیلی ضرور آسکتی ہے۔ ان کے ایسے موثر تنظیمی عمل سے آئندہ حکومتوں کے ہاتھ بھی مضبوط ہوں گے۔

گنّے کے کاشتکار چینی کے کارخانہ داروں کے ہاتھوں تباہ ہو رہے ہیں

ضلع تھر پارکر کے چھوٹے زمینداروں نے گورنر سندھ سے اپیل کی ہے کہ وہ میر پور خاص شوگر ملز کے اربابِ اختیار کو چھوٹے زمینداروں سے گنّا خریدنے میں ترجیحی سلوک برتنے کی تاکید کریں۔ انہیں شکایت ہے کہ نہ صرف میر پور خاص شوگر ملز میں بلکہ مغربی پاکستان کی تمام شوگر ملوں میں چھوٹے زمینداروں سے گنا خریدنے میں لیت ولعل سے کام لیا جاتا ہے جس کی وجہ ہزاروں چھوٹے زمیندار ہر سال نقصان اٹھاتے ہیں۔ شوگر ملز کے مالک عام طور پر جاگیرداروں اور بڑے زمینداروں سے گنّا خریدتے ہیں بلکہ خریداری کے آرڈر اتنی فراخدلی سے جاری کرتے ہیں کہ بڑے زمیندار اس کے مطابق گنّا سپلائی نہیں کر سکتے چنانچہ باقی گنّا چھوٹے زمینداروں سے خرید لیتے ہیں۔

عام طور پر شوگر ملز کے مالک گنّا اٹھانے کے سلسلے میں یہ بہانا تراشتے ہیں کہ زیادہ فاصلہ کا گنّا اٹھانا ان کے لئے ممکن نہیں لیکن یہاں صورت حال یہ ہے کہ دس میل کے اندر چھوٹے زمینداروں کا بے حساب گنّا پڑا ہوا ہے جسے اٹھانے والا کوئی نہیں۔ اگر چھوٹے زمینداروں کے گنّے کی کھپت کا فوراً کوئی معقول انتظام نہیں کیا گیا تو سینکڑوں کاشتکار تباہ ہو جائیں گے اور ان کے لئے قرض کی ادائی ممکن نہیں رہے گی۔

ادھر پنجاب میں لائل پور مزدور کسان پارٹی نے ایک قرارداد میں حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ گنّے پر لگایا جانے والا فی من ۴ رزائد ٹیکس ختم کیا جائے۔ سرگودھا کی پیپلز پارٹی کے چیرمین جناب ممتاز احمد کاہلوں نے مطالبہ کیا تھا کہ حکومت شوگر فیکٹریوں میں ہونے والی دھاندلیوں کی تحقیقات کرائے۔

بنّوں مزدور کسان پارٹی کے سینئر نائب صدر سعید خاں نے ۲ر فروری کو پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ بنّوں شوگر ملز کے مالکان کا رویّہ کاشتکاروں کے ساتھ انتہائی غیر منصفانہ ہے۔ غریب کاشتکاروں کا گنا سڑکوں پر پڑا سڑ رہا ہے اور مالکان اسے خریدنے کے لئے تیار نہیں انہوں نے بتایا ملز ۴۰ ہزار من گنا ۲۴ گھنٹے میں بیل سکتی ہے لیکن محض کاشت کاروں کو پریشان کرنے کے لئے روزانہ پندرہ ہزار من گنّا بیلا جا رہا ہے۔

شوگر ملوں کے سلسلے میں چھوٹے کاشتکاروں کو بہت ساری شکایتیں ہیں جن میں سے چند ایک کا ذکر اوپر کیا گیا ہے شوگر ملوں پر جن سرمایہ داروں کا قبضہ ہے وہ فطری طور پر اپنے مددگار یعنی جاگیردار اور بڑے زمینداروں کو فائدہ پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ شوگر ملوں کے مالکان اور جاگیرداروں اور بڑے زمینداروں کے اس گٹھ جوڑ سے چھوٹے زمیندار برسوں سے خسارے کی چکّی میں پس رہے ہیں۔ ہمارے ملک میں چھوٹے زمینداریوں ہی بے شمار مشکلات میں گھرے ہوئے ہیں آن کی پیداوار کو خریدنے سے انکار انہیں تباہ کرنے کی ایک کھلی سازش ہے، حکومت چھوٹے زمینداروں کی گنّے کی فصل کی فروخت کی ضمانت جب تک نہ دے گی یہ غیر یقینی حالت باقی رہے گی۔ اور شوگر ملوں کے مالکان مختلف حیلے بہانوں سے انہیں لوٹنے کی کوشش کرتے رہیں گے اس کے ساتھ ساتھ گنے کی قیمت کا تعیّن اس طرح کیا جائے کہ کاشتکاروں کا خرچ اور واجب الادا قرض دونوں کے بقدر سرمایہ مل سکے۔

شوگر ملوں میں یہ صورت حال اس لئے پیدا ہوئی ہے کہ یہاں بھی صنعت پر وہی لوگ قابض ہیں جن کے قبضے میں ملک کی دوسری کئی صنعتیں ہیں۔ شکر اور اس کی متعلقہ صنعتوں میں سرمایہ کاری کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

شوگر ملز کا نام	مالک	سرمایہ	منافع
آدمجی شوگر ملز	آدم جی	۱ کروڑ ۵۰ لاکھ	۱۰ر۸۳ فیصد
بہاول نگر	-	۲ کروڑ	-
بادانی	بادانی	۱ کروڑ ۵۰ لاکھ	۲۷ر۴۵ فیصد
چارسدہ	نواب ہوتی	۱ کروڑ ۵۰ لاکھ ۵۰ ہزار	-
کریسنٹ	کریسنٹ	۳ کروڑ ۴۵ لاکھ	۲۸ر۰۲ فیصد
فرنٹیئر	-	۵۶ لاکھ ۲۵ ہزار	۲ر۱۱ فیصد
حبیب	حبیب	۱ کروڑ ۷۵ لاکھ	۲۵ر۵۲ فیصد
حسین	حسین	۱ کروڑ ۷۵ لاکھ	-

حبیب سنز	حبیب سنز	اکروڑ ۵، لاکھ	۲۸،۴۴ فیصد	پریمیئر	-	اکروڑ ۵۳ لاکھ ۳۵ ہزار	۱۶،۹۴ فیصد
میرپورخاص	-	اکروڑ ۵۰ لاکھ	۲۰،۳ فیصد	شاہ تاج	شالیمار	اکروڑ ۵، لاکھ	-
مری	-	۴۳ لاکھ ۲۰ ہزار	۵۰،۵۱ فیصد	تھل	-	اکروڑ	۱۹،۶۰ فیصد
مہران	حاجی ہاشم مغل	اکروڑ ۵، لاکھ	-				
نون	نون	اکروڑ ۵۰ لاکھ	۲۴،۱۲ فیصد		کل میزان :-	۱۹،۴۴،۹۵،۰۰۰	

رہے ہیں جس کے ذریعے ماضی میں وہ جمہوریت کا قتل کر چکے تھے تو ہمیں اپنے اردو کے نادان دوستوں کی بیچارگی پر انتہائی صدمہ پہنچتا ہے۔ اسلامی نظام کی سب سے بڑی دعوے دار اور استحصالی نظام کی سب سے بڑی علمبردار جماعت کے ترجمان اور دانشور نے اپنے اخبار کراچی میں ۲۴ جنوری کو "اردو سندھی کا تنازعہ" کے عنوان سے اداریہ لکھتے ہوئے فرمایا ہے۔

"آخر اس میں حرج ہی کیا ہے کہ سندھ کے دفاتر میں سندھی کے ساتھ ساتھ اردو بھی سرکاری زبان کے طور پر رائج رہے۔"

لیکن اسی "اسلامی جماعت" کے بنگلہ ترجمان روزنامہ "سنگرام" ڈھاکہ کی ۲۲ر فروری کی اشاعت سے ہم یہ اداریہ نقل کرتے ہیں جس کا عنوان ہے "پاکستان کا لسانی مسئلہ" اس کے ساتھ ساتھ ہم اس "جماعت اسلامی" کے بہی خواہوں اور ہمدردوں سے یہ التماس بھی کریں گے کہ جماعت اسلامی کے بنگلہ ترجمان کے اس اداریے کو پڑھنے کے بعد وہ اس نقاب پوش جماعت کے ان سیاسی مفادات کو ضرور اپنے پیش نظر رکھیں جو ایک طرف سندھ میں اردو بولنے والوں سے وابستہ ہیں اور دوسری طرف بنگال میں بنگلہ بولنے والوں سے کیونکہ یہی وہ سیاسی وابستگی ہے جو جماعت اسلامی کے شمیم احمد سے لیکر الطاف حسن قریشی جیسے اسلام پسند دانشوروں کو مولانا عبدالرحیم نائب امیر جماعت اسلامی اور پروفیسر غلام اعظم کے ساتھ اسلامی اور پاکستانی رشتے میں منسلک کرتی ہے۔ جن کا یہ مطالبہ ہے کہ مشرقی پاکستان میں مذہبی تعلیم اردو کی بجائے بنگلہ زبان میں ہونی چاہیئے اور بنگلہ کو ہی ملک کی واحد قومی زبان بنانی چاہیئے۔ اب آپ اداریہ ملاحظہ فرمائیں۔

روزنامہ سنگرام

جمعہ ۱۲ فروری ۱۹۷۱ء

پاکستان کا لسانی مسئلہ

آخر کار سندھی اردو اختلافات نے بھی سر اٹھایا اور اب سندھی اردو کے خلاف ہمہ گیر مہم چلا رہے ہیں۔ ہم سمجھتے تھے کہ بنگلہ اردو تنازعہ ختم ہونے کے بعد لسانی مسائل ختم ہو جائیں گے۔ یہ سوچتے ہوئے ہم جس غلط فہمی میں مبتلا تھے وہ اب کھل کر سامنے آگئی ہے۔ ہماری غلط فہمی یہی تھی کہ ہم نے اردو کو مغربی پاکستان کی زبان سمجھتے ہوئے اردو کو بنگلہ کے مساوی قومی زبان تسلیم کر لیا تھا کہ اس سے تمام صوبوں کے عوام کی خواہشات کی تکمیل ہو جائے گی۔ لیکن ون یونٹ ٹوٹتے ہی اب یہ پتہ چلا کہ وہاں کے چار صوبوں کی الگ الگ زبانیں ہیں اور اب ہر صوبے میں اپنی زبان کی حیثیت تسلیم کرانے

باقی صفحہ ۴۳ پر ملاحظہ فرمائیں

ڈھاکہ سے ایک خط :- احمد الیاس

بنگلہ کو پورے پاکستان کی واحد سرکاری زبان بنایا جائے

——— سنگرام ڈھاکہ

سندھی کے ساتھ اردو کو بھی سرکاری زبان بنایا جائے

——— جسارت کراچی

جماعت اسلامی یہاں بھی لسانی تنازعہ پیدا کر رہی ہے

دس بارہ سال قبل کا واقعہ ہے کہ ڈھاکہ کے ایک مشاعرے میں ایک کشمیری شاعر نے ایک نظم پڑھی تھی جس کا ایک مصرعہ یوں تھا کہ "اردو زبان خطرے میں ہے۔" آج جب کہ اردو پر یہ عجیب وقت پڑا ہے، یہ شاعر بھی یاد آیا۔ اور اسکی پیشگوئی بھی۔ زبان کا مسئلہ اتنا نازک اور اسقدر جذباتی ہے کہ اسکے بارے میں کچھ کہتے ہوئے ہمیشہ یہ سوچنا پڑتا ہے کہ

انہیں ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو!

لیکن اس وقت بات کچھ ایسی ہے کہ زبان کا مسئلہ مکمل طور پر ایک سیاسی مسئلہ بن گیا ہے اور وطن عزیز کے ایک حصے میں اس مسئلہ نے اتنی نازک صورت اختیار کر لی ہے کہ ہم اس وقت نہ تو اپنے جذبات کا پاس رکھ سکتے ہیں اور نہ ہی آبگینوں کا کچھ خیال کر سکتے ہیں۔ اردو ہماری بھی مادری زبان ہے اور ڈھاکہ میں رہنے والے یوسف حسن صاحب سے لے کر ابو سعید خاں تک اکثر افراد نے اسی زبان کی آغوش میں پرورش پائی ہے۔ مگر جب ۱۹۵۲ء میں بنگال کے جیالے فرزندوں نے بنگلہ زبان کو بھی قومی زبان بنانے کی تحریک چلائی تو سینکڑوں اور ہزاروں بنگالی نوجوان، طالب علموں اور ادیبوں کے ساتھ یوسف حسن، ابو سعید خاں اور ڈاکٹر عثمان جیسے کئی اردو داں اور اردو دوستوں کے لئے بھی جیل کے دروازے کھل گئے۔ اس لئے نہیں کہ ان کی مادری زبان اردو تھی بلکہ اس لئے کہ انہوں نے مادری زبان کا احترام کیا تھا۔ ۱۹۵۲ء سے آج تک اردو کا ردنا سب سے زیادہ مشرقی پاکستان میں رویا گیا۔ اور بنگلہ بولنے والوں کے خلاف دنیا بھر کے پروپیگنڈے مغربی پاکستان میں کئے گئے۔ اردو کو اسلامی زبان قرار دیا گیا اور بنگلہ کو ہندوؤں کی زبان سے تشبیہہ دی گئی۔ اردو بولنے والے سچے پاکستانی کہلائے اور بنگالیوں کی حب الوطنی مشکوک سمجھی گئی۔ اردو کے نام لیواؤں نے اردو کو ڈھال بنا کر خود مشرقی پاکستان کے اردو بولنے والوں پر تلوار چلائی اور وہ ملک میں سرخرو ہوئے لیکن جن اردو دوستوں نے ان عناصر کی نقاب کشائی کی ان کی سازشوں سے اردو بولنے والوں کو خبردار کیا وہ معتوب ٹھہرے۔ زیادہ دن نہیں گزرے کہ اس انتخاب کے موقع پر بڑے بڑے سیاسی سورماؤں نے مشرقی پاکستان کے اردو بولنے والے معصوم اور بھولے بھالے عوام کو ورغلانے کی کیا کیا نہ تدبیریں اختیار کیں۔ اردو کے ان ادیبوں اور شاعروں کو جو اس ملک کے استحصالی طبقے کے خلاف اپنے قلم سے جنگ کر رہے تھے سوشلسٹ، کمیونسٹ، ترقی پسند، ملحد اور کافر قرار دے کر ان کا معاشی قتل عام کیا گیا اور دوسری جانب اسلام پسند اور اسلامی ادب کے نام پر اردو بولنے والوں کا سیاسی اور ثقافتی استحصال کرنے کی سازشیں کی گئیں

مشرقی پاکستان میں ان عناصر نے اردو کے نام پر اردو کو جتنا نقصان پہونچایا اس کا اندازہ تو خود یہاں کے اردو داں حضرات ہی لگا سکتے ہیں لیکن آج بھی جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ نقاب پوش اردو دشمن مغربی پاکستان میں اپنی سرگرمیوں میں مصروف ہیں اور لسانی تعصب کا وہی گھناؤنا کھیل کھیل

حسن عابدی

ساتواں صفحہ

سیاست میں صغر خاں کے عروج کا زمانہ وہ تھا، جب انہوں نے سیاست سے ریٹائر ہونے کا اعلان کیا تھا۔ اب انہوں نے ایسا کوئی اعلان نہیں کیا، لیکن آج کل سے زیادہ ریٹائر وہ کبھی نہیں ہوئے تھے۔ ایسے لوگوں کے ساتھ یہی مشکل ہے کہ جو کہتے ہیں، وہ کرتے نہیں، اور جو کچھ کرتے ہیں، اس کی کانوں کان کسی کو خبر نہیں ہونے دیتے۔ کیا چُپ چپاتے ریٹائر ہوئے ہیں، ایئر مارشل صاحب۔

خبر سُنی ہے کہ مغربی جرمنی میں کسی بوڑھے جرمن کے پاس ایک ٹیپ ریکارڈر ہے، جس میں مُردوں کی آوازیں ٹیپ کی گئی ہیں۔ علاوہ اور لوگوں کے، اس میں ہٹلر کی آواز بھی دفن ہے۔ پچھلے دنوں جب ہم نے سُنا کہ ایّوب کھوڑو نے اپنے ریٹائرمنٹ کے بارے میں افواہوں کی تردید کی ہے تو یوں محسوس ہوا، جیسے بوڑھے جرمن کا ٹیپ ریکارڈر کھُل گیا ہے اور آواز حلق سے نہیں کنویں سے نکل رہی ہے۔ اصغر خاں نے اعلان نہیں کیا لیکن ریٹائر ہو گئے۔ ایّوب کھوڑو نے ریٹائرمنٹ کی تردید کر دی لیکن سیاست سے ان کی وابستگی ثابت نہیں ہوتی۔

سیاست سے ریٹائر ہونے کے لئے اعلان کی بھی ایک ہی رہی۔ جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے، یہ بدعت چودھری محمد علی نے شروع کی تھی۔ اُس وقت کسی نے یہ نہیں پوچھا کہ جناب چودھری صاحب! جب آپ سیاست میں وارد ہوئے تھے، اس وقت کونسا نقارہ بجایا تھا۔ جواب علیحدگی کا ڈھول پیٹ رہے ہیں۔ چودھری صاحب کے عرصۂ ملازمت اور سیاست کے درمیان کوئی حدِ فاصل نہ تھی۔ انہوں نے یہ محسوس ہی نہیں ہونے دیا کہ سکرٹیریٹ سے کس وقت دبے پاؤں ایوانِ وزارت میں داخل ہو گئے۔ وہ ملازمت میں ایک سیاستدان تھے اور سیاست میں ایک ملازم سرکار کی طرح مواخذے اور احتساب کے خوف سے بالاتر۔

میاں ممتاز دولتانہ، خرابیٔ صحت کے باعث سیاست سے ریٹائر ہوئے تھے۔ معلوم نہیں کس ڈاکٹر نے انہیں یہ مشورہ دیا تھا کہ سیاست میں حصّہ لینے سے صحت خراب ہو جاتی ہے۔ بہر حال انہوں نے الگ ہو کے بھی دیکھ لیا۔ صحت بہتر تو کیا ہوتی خراب تر ہو گئی، لہٰذا بعجلت تمام واپس آ گئے

ترا جانا نہ تھا ظالم مگر تمہید آنے کا

اور صغر خاں کے استعفے کا مضمون عدم کے الفاظ میں یوں تھا

شاید مجھے نکال کے پچھتا رہے ہوں آپ
محفل میں اِس خیال سے پھر آ گیا ہوں میں

سیاست سے ریٹائر نصر اللہ خاں بھی ہوئے ہیں، لیکن کیا ضروری ہے کہ اس کا اعلان بھی کریں۔ الکشن سے پہلے طوفان کی طرح اُٹھے تھے، الکشن کے بعد گرد کی طرح بیٹھ گئے۔ اب ٹُک ٹُک ارباب سیاست کا تماشہ دیکھتے ہیں۔ ٹھنڈی آہ کھینچتے ہیں اور دھواں اُڑاتے ہیں، کبھی کبھی حُقّے کی نَے مُنھ سے سرکا کر کوئی بیان بھی جاری کر دیتے ہیں، لیکن تقاضہ نہیں کرتے کہ اس کا سنجیدگی سے نوٹس لیا جائے۔ بھلا آب ان میں اور چودھری خلیق الزماں میں کیا فرق رہ گیا، سوائے اس کے کہ نصر اللہ خاں، اس گئی گذری حالت میں بھی اپنے حُقّے سے زیادہ بولتے ہیں۔

میاں طفیل محمّد کو دیکھ لیجئے۔ کیا اُن کے ریٹائر ہونے میں کوئی کسر رہ گئی ہے؟ لیکن مجلسِ مشاورت میں اب بھی مودودی صاحب کے آس پاس بیٹھے ہوئے نظر آ جاتے ہیں۔ کوئی پوچھے کہ آپ کیا اور آپ کی سیاست کیا۔ اسی پہ پھُولے ہوئے ہیں کہ جماعتِ اسلامی کو اب کے کھالیں بہت ملیں۔ یعنی جماعتِ اسلامی عوام میں پہلے سے زیادہ مقبول ہو گئی ہے جو سیاسی پارٹی عوام میں اپنی مقبولیت کا اندازہ کھالوں کی تعداد سے کرتی ہے، اس کی سیاسی بصیرت، چمڑے کے بیوپاری سے زیادہ کیا ہو گی۔ ٹھیک ہے، جس کا کام اسی کو ساجھے۔ جماعتِ اسلامی نے خواہ مخواہ آئین وائین کے چکّر میں وقت ضائع کیا۔ کھال جمع کرتی رہتی تو اب تک کھالوں کے کئی کارخانوں کی مالک ہوتی۔

ہمارے یہاں الکشن کے بعد ریٹائرڈ سیاستدانوں کی ایک بہت بڑی کھیپ پیدا ہو گئی ہے۔ پہلے ان سب کا تعلّق انتخابی جوڑ توڑ اور سوشلزم کے خلاف بے سر و پا بیان بازی سے تھا، الکشن کے بعد یہ سلسلہ بھی ختم ہوا۔ اب بیٹھے منھ سے مکّھی جھل رہے ہیں۔ فلاں نوابزادہ صاحب، فلاں مخدوم زادہ صاحب، جرنیل صاحب، ایئر مارشل صاحب، چودھری صاحب، ملک صاحب، فغفور صاحب، مرحوم و مغفور صاحب، سارے یک قلم بے روزگار ہوئے۔ عوام میں ہوتے، عوام کے مسائل سے تعلّق رکھتے، تو آج بھی اُن کے شریکِ حال ہوتے۔ الکشن کے بعد مسائل ختم نہیں ہو گئے، بلکہ یہی وقت ہے کہ اِن مسائل پر زیادہ ٹھنڈے دل و دماغ سے بات کی جاتی۔ لیکن بات کون کرے اور کیوں کرے؟ — شکست خوردہ اربابِ سیاست کا رویّہ وہی ہے، جس کا اظہار وہ پہلے کر چکے ہیں کہ قوم نے جب ہمیں اپنے اعتماد کا اہل ہی نہیں سمجھا تو بھاڑ میں جائے ایسی قوم۔

جو لوگ پاسپورٹ پر سفر کرتے ہیں

ایک سادہ لوح نے پوچھا، یہ پاسپورٹ آفس کس لئے ہوتے ہیں؟

دوسرے نے جواب دیا، جو لوگ ملک سے باہر جانا چاہتے ہیں، انہیں روکنے کے لئے۔

پہلا بولا، اور یہ جو ٹھاکر لچھمن سنگھ اپنے ۱۶۰ آدمیوں کے ساتھ ہندوستان گئے ہیں تو کیا پاسپورٹ آفس نے انہیں حملہ کرنے کو بھیجا ہے؟

دوسرے نے سمجھایا کہ وہ کوئی پاسپورٹ لے کے تھوڑے ہی گئے ہیں۔ ایک سخت گیر چوبدار سے کسی صاحبِ معاملہ نے ڈرتے ڈرتے کہا، خان صاحب اجازت ہو تو میں دفتر میں چلا جاؤں۔ خان صاحب نے ڈپٹ کر جواب دیا، بالکل نہیں۔ وہ آدمی چپکا کھڑا رہا۔ اتنی دیر میں کئی لوگ آئے اور دندناتے ہوئے دفتر میں گھُس گئے۔ وہ آدمی بولا، خان صاحب یہ انصاف تو نہ ہُوا، آپ نے مجھے روک دیا اور دوسروں کو اندر جانے کی کھُلی چھُٹی دیدی۔ خان صاحب بولے، انھوں نے مجھ سے پوچھا تھوڑے ہی تھا، جو میں انہیں روکتا۔ تم نے پوچھا تھا، تمہیں روک دیا۔

یہ خان صاحب، اور ان کے بھائی، سب پاسپورٹ کے دفتر میں ملازم ہیں۔ ٹھاکر لچھمن سنگھ اور ان کے حوالی موالی اگر ان سے پوچھتے کہ ذرا ہندوستان چلے جائیں تو یہ ہرگز نہ جانے دیتے۔ ہم آپ پوچھتے ہیں تو حکم ہوتا ہے کہ دھوپ میں قطار باندھ کر کھڑے ہو جاؤ اور سال دو سال انتظار کرو، پھر دیکھو کیا ہوتا ہے۔ ٹھاکر لچھمن سنگھ، اپنے ۱۶۰ آدمیوں کا قافلہ ہمراہ لے کر یہاں سے نالکی پالکی میں لدے پھندے روانہ ہوئے۔ اس قافلے میں اونٹ، گھوڑے، جیپیں، کاریں، قیمتی سامان از قسم نقرئی و طلائی ظروف، بیش قرار قالین اور پردے، زیورات اور روپوں کی تھیلیاں، زادِ سفر کے لئے طرح طرح کے پکوان، مشروبات و ماکولات ساتھ تھے۔ یہ اہتمام دیکھئے اور پاسپورٹ پر سفر کرنیوالوں کا احوال دیکھئے کہ معلوم ہوتا ہے، حوالات سے ضمانت پر چھوٹے ہیں۔ سر پہ گرد، چہرے پہ ہوائیاں اُڑتی ہوئی، کسٹم کا عملہ چوروں کی طرح تلاشی لے رہا ہے۔ بچے بلک رہے ہیں اور عورتیں سر پہ خاک ڈال رہی ہیں۔

پاسپورٹ پر سفر اور پھر ہندوستان کا سفر، نمونہ سقر ہوتا ہے۔

اِنقلابی طریقِ جنگ کیا ہے؟ | اقبال احمد

گوریلا عوام میں کس طرح کام کرتے ہیں؟

امریکہ کا یہ موقف کہ گوریلاؤں کا کام آسان ہوتا ہے، کیونکہ وہ محض توڑ پھوڑ کرتے ہیں' درست نہیں کیونکہ اس موقف سے ان لوگوں کے مرتب کردہ نتائج کی تردید ہوتی ہے' جنھوں نے ان تحریکوں کا مطالعہ اور مشاہدہ کیا ہے۔ اس مرحلے میں فوجی تصادم سے بالعموم گریز کیا جاتا ہے، اور خود حکومت بھی قتل کی وارداتوں کو پولیس کی دردسری تصور کرتی ہے اور ٹیکسوں کی عدم ادائیگی کو انتظامی کوتاہی اور فصل کی خرابی وغیرہ پر محمول کرتی ہے۔

ویت کانگ کے بارے میں معلوم ہے کہ انھوں نے ۱۹۵۷ء-۶۰ کے درمیانی عرصے میں ویت نام کے ۸۰ فیصد سے زائد دیہی علاقے پر قبضہ کرلیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب امریکی' بچاؤ ڈیم کو، بچا ہو' (ہوچی منہہ) کا حریف اور مقابل بنا کر پیش کررہے تھے اور یہ کہتے پھر رہے تھے کہ "دیکھو تو! ویت نامی فوج کے کسی یونٹ پر حملہ نہیں کیا جارہا ہے۔ اس لئے گوریلا کارروائی کا کوئی خطرہ موجود نہیں۔"

یہ مفروضہ بھی انتہائی جوش وخروش سے پیش کیا جاتا ہے اور یہ انتہائی خود فریبی پر مبنی ہے کہ گوریلاؤں کو شہری آبادی کا تعاون محض ان کی دہشت گردی کی بنیاد پر حاصل ہوتا ہے۔ گوریلا جنگ کے لئے انتہائی وفا پیشہ اور بے حد خفیہ شہری تعاون درکار ہے اور اس طرح کا تعاون پستول کی نالی سینے پر رکھ کر حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بات محض معتدل اور شکست خوردہ گوریلاؤں کے بارے میں معلوم ہوئی ہے کہ انھوں نے شہری آبادی کو دہشت زدہ کر کے عوامی تعاون سے محرومی کا خطرہ مول لیا (یہ کچھ ہُک اور ملایا کے گوریلا تھے' جو اپنی سطح سے گر کر اس درجے کو پہنچے) گوریلا جنگ کی تربیت کا ایک امتیازی پہلو یہ ہے کہ اس میں شہری آبادی کے ساتھ انتہائی محتاط پیرائے میں" صحیح اور منصفانہ" سلوک کی تاکید کی جاتی ہے۔ جنرل گیاپ (شمالی ویت نام کی افواج کے کمانڈر انچیف) کا عقیدہ یہ ہے کہ سیاسی کام "فوج کی رُوح ہے" اور چین کا گوریلا ماہر یہ کہتا ہے کہ "فوج کی نظریاتی تربیت کا بنیادی مقصد' فوجیوں کو اس طرح کے عمل کے لئے تیار کرنا ہے جس کے ذریعہ وہ (عوام کا) مکمل تعاون حاصل کر سکیں۔"

لہٰذا گوریلا جب دہشت کا طریقہ استعمال کرتے ہیں تو وہ سماجی اور نظریاتی دونوں اعتبار سے انتہائی محدود ہوتا ہے۔ اس کارروائی کی زد اُن لوگوں پر پڑتی ہے جو بالعموم "عوام کے دشمن" گردانے جاتے ہیں۔ یعنی حکام، جاگیردار اور راسی قبیل کے دوسرے لوگ۔

کسی دیہات کے سرپنچ کو قتل کرنا، ایک نہایت پیچیدہ عمل ہوتا ہے۔ چونکہ بیشتر سرپنچ یا سردار مقامی کسان ہوتے ہیں اور انھیں پرانی روایات اور قرابت داریوں کے تحت لوگوں کی وفاداری اور ایک طرح سے اپنے جواز کی سند حاصل ہوتی ہے لہٰذا پُرجوش انقلابیوں کو یہ بات نہایت موزوں نظر آتی ہے کہ انھیں اپنے ساتھ تحریک میں شمولیت پر آمادہ کرلیں۔ لیکن جب یہ کوشش ناکام ہوجاتی ہے تو ان کے قتل کا منصوبہ بنانے میں اور گاؤں والوں کو اس کارروائی کی قبولیت پر آمادہ کرنے میں نہایت صبر آزما سیاسی کام کرنا پڑتا ہے۔ الجزائری انقلاب کے ابتدائی برسوں میں قومی محاذِ آزادی کو گاؤں کے ایک سربراہ کے قتل میں اور پھر اس طرح کے قتل میں کہ اس سے عوام کی خفگی کا اندیشہ لاحق نہ ہو۔ دو ماہ سے لے کر ایک سال لگ جاتے تھے اور یاد رہے کہ یہ نوآبادیاتی نظام کے خلاف جنگ تھی۔ اسی لئے یہ سُن کر مجھے حیرت ہوئی کہ ویت نام میں ۱۹۵۷ء اور ۱۹۶۱ء کے درمیان تقریباً ۱۳ ہزار مقامی حکام کو موت کے گھاٹ اُتارا گیا تھا۔ پروفیسر برنارڈ فال اس کی ایک سادہ سی توجیہہ پیش کرتے ہیں۔ یہ سردار جنھیں ڈیم نے نامزد کیا تھا، ویت منہہ کارکنوں کے مقابلے میں اپنے جواز کی کوئی سند نہیں رکھتے تھے کیونکہ ویت منہہ نے تو مُلک کو فرانس کے تسلط سے آزاد کرایا تھا۔ اس کے علاوہ مقامی حکام' امریکیوں کی تیار کردہ اور تربیت یافتہ فوج کے ساتھ اُن بڑے بڑے زمینداروں کی واپسی اور بحالی کے شرمناک کاروبار میں ملوث ہو گئے' جو دورانِ جنگ میں مُلک سے نکل بھاگے تھے۔ (ایک حقیقی زرعی اصلاح صرف ویت منہہ کے ماتحت روبہ عمل آئی تھی)۔ حد تو یہ ہے کہ ان غیر حاضر شاہ پرست زمینداروں نے پچھلے آٹھ برس کی لگان کا بھی مطالبہ کردیا جس میں ۱۹۴۵ء سے لے کر ۱۹۵۴ء تک کا عرصہ شامل تھا۔ جنگ سے پہلے لگان کی شرح پیداوار کا ۵۰ فیصد تھی۔ اس طرح کسان کو اپنی پیداوار کا ۴۰۰ فیصد ادا کرنا اور زمین پر اپنی ملکیت کے حق سے دستبردار ہونا لازمی ٹھہرا۔ اب ویت کانگ کے لئے یہ کوئی مسئلہ نہیں رہا کہ جو عہدیدار اس طرح کے کام کررہے ہیں کسان ان کے قتل کی کارروائی کو قبول کرلیں۔

دہشت کا استعمال، جہد آزما کارکنوں کی حفاظت اور تحریک کی بقا کی خاطر بھی ہوتا ہے۔ نیویارک ٹائمز (۳۰ مئی ۱۹۶۵ء) میں رابرٹ کلیمن نے یہ اطلاع دی تھی کہ ویت نام کے "متنازعہ علاقوں میں' جہاں ۴۰ فیصد آبادی رہتی ہے' سیگاؤں کی سرکاری حکومت کو دن کے وقت عام شہریوں کا تعاون حاصل ہوتا ہے اور رات کے وقت ویت کانگ کو۔ کیونکہ اس کے دستے اور عہدیدار اس وقت موجود رہتے ہیں۔ یہ ایشیائی باشندوں کی ایک پرانی رسم ہے۔"

اس آخری فقرے سے مجھے بڑی ہنسی آئی کیونکہ میں جانتا ہوں کہ یہ محض ہماری رسم نہیں ہے بلکہ دُنیا بھر میں گوریلا جنگ کا مسلمہ طریقہ ہے۔ کوئی آبادی اگر یہ اُمید کرتی ہے کہ سرکاری فوجوں کے بھرپور معاندانہ سلوک سے بچی رہے تو اسے خود کو کم از کم غیر جانب دار ضرور ظاہر کرنا ہوگا۔ باغی دستے اور باغی افسران کے وقت "کہیں پہاڑوں سے نکل کر" نہیں آتے۔ وہ دن کے وقت بھی موجود ہوتے ہیں اور اکثر حکومت کی اطاعت کا ڈھونگ رچانے میں بھی آگے آگے رہتے ہیں۔ رات کے وقت یہی وفادار کسان گوریلا بن جاتے ہیں اور پھر سبھی متعلقہ لوگ انہیں اسی حیثیت سے پہچانتے ہیں۔ اس بات کی ضمانت حاصل کرنے کے لئے کہ عوام میں پھیلی ہوئی خاموشی کی اس گہری سازش کے درمیان کوئی رخنہ پیدا نہ ہو' ان لوگوں کو عبرتناک سزائیں دی جاتی ہیں' جن کے بارے میں یہ شک ہوتا ہے کہ انھیں حقیقتِ حال معلوم ہوچکی ہے۔

دوسرے درجے کی دہشت گردی' جو بالعموم قتل پر منتج نہیں ہوتی' حکومت کی ان کوششوں کو ناکام بنانے کے لئے کی جاتی ہے' جو وہ عوامی تعاون حاصل کرنے کے لئے بالعموم تاخیر سے اختیار کرتی ہے۔ ایسے موقعوں پر سرکاری اسکولوں کے مدرس اور ہیلتھ ورکر بالعموم اغوا کئے جاتے ہیں اور ان کی نظریاتی تربیت ہوتی ہے۔ جون ۱۹۶۲ء میں اقوامِ متحدہ کے اندر جنوبی ویت نام کے ایک مبصر نے یونیسکو کو بتایا کہ ویت کانگ نے ۱۲ سو سے زائد اُستادوں کو اغوا کرلیا ہے۔ اسی طرح انسدادِ ملیریا کی سرکاری مہم ناکام ہوگئی کیونکہ ۲۲ ہیلتھ افسروں کو قتل اور ساٹھ کو اغوا کرلیا گیا ہے۔

گوریلا، اس طرح کے سبوتاژ میں بالعموم یہ احتیاط کرتے ہیں کہ آبادی کو زیادہ سخت مشکلات کا سامنا نہ ہو اور معیشت کو اس طرح نقصان پہنچے کہ اس کے اثرات طویل عرصے پر محیط ہوں۔ صنعتوں کو، حتیٰ کہ غیر ملکی مالکوں کے کھیتوں کو بھی کارروائی کا نشانہ نہیں بنایا جاتا، بشرطیکہ وہ محاذِ آزادی کو "ٹیکس ادا کرتے رہیں" اور جب حکومت ان کی حفاظت میں ناکام ہوجائے تو انہیں اس طرح کا "ٹیکس" ادا کرنا پڑتا ہے۔

(باقی آئندہ)

سچے عوامی رہنما کا فرض عوام کی پیروی نہیں بلکہ رہنمائی ہے

قیادت کی کوتاہی کی چار نمایاں مثالیں، دائیں بازو کے لیڈر اِن سے فائدہ اُٹھا رہے ہیں

سیّد سبطِ حسن

اور موسیٰ کی قوم نے موسیٰ کے پہاڑ پر چلے جانے کے بعد اپنے زیوروں کو سامری کے کہنے پر گلایا اور ایک بچھڑا بنایا جس میں سے آواز نکلتی تھی۔ اور جب موسیٰ اپنی قوم کی طرف واپس آئے اور یہ ماجرا دیکھا تو اُن کو بہت غصّہ آیا اور انہوں نے قوم سے کہا کہ تم نے بڑی نامعقول حرکت کی ہے۔ اور وہ اپنے بھائی اور نائب ہارون پر بہت خفا ہوئے۔ ہارون نے کہا کہ مجھے یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں آپ مجھ پر یہ الزام نہ لگائیں کہ تم نے بنی اسرائیل میں پھوٹ ڈال دی۔ (سورہ اعراف و سورہ طٰہٰ)

اس داستان کے چار کردار ہیں۔ اول حضرت موسیٰؑ جو قوم بنی اسرائیل کے قائد تھے، دوم ان کے نائب حضرت ہارونؑ جنہوں نے بنی اسرائیل کو گئو سالہ پرستی سے اس ڈر سے منع نہیں کیا کہ مبادا قوم میں پھوٹ پڑ جائے۔ سوم قوم بنی اسرائیل جو حضرت موسیٰ کی قیادت میں مصر سے ہجرت کر کے فلسطین میں آباد ہوئی تھی اور چہارم سامری جادوگر جس نے حضرت موسیٰ کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر بنی اسرائیل کو بہکایا اور سونے کے بچھڑے کی عبادت پر آمادہ کیا۔

اس داستان کا سب سے اہم پہلو حضرت موسیٰؑ کا طرز عمل ہے۔ انہوں نے عہد غلامی میں بنی اسرائیل کو ایک مخصوص نظریۂ حیات کے تحت متحد اور منظم کیا تھا۔ اسی نظریے کے مطابق فرعون سے جدوجہد کی تھی اور پھر پوری قوم سمیت مصر سے ہجرت کر کے فلسطین میں آباد ہوتے تھے۔ لیکن قوم کے مزاج میں دیوی دیوتاؤں کی پرستش اتنی رچ بس گئی تھی کہ اِدھر حضرت موسیٰؑ نظروں سے اوجھل ہوئے، اُدھر بت پرستی کا پُرانا شوق بیدار ہو گیا۔ اُن کے نائب ہارونؑ بھی موسیٰؑ کی مانند موحد تھے۔ لیکن اُن کی قیادت کی صلاحیت ہنوز خام تھی۔ وہ قوم والوں کو ناخوش کرنے سے ڈرتے تھے پھر اُن کو یہ اندیشہ بھی تھا کہ اگر میں نے بنی اسرائیل کو بُت پرستی سے روکا تو کہیں قومی اتحاد پارہ پارہ نہ ہو جائے۔ انہوں نے موسیٰؑ کے نظریۂ حیات کو وقت کی مصلحتوں پہ قربان کر دیا۔ اس کے برعکس موسیٰؑ کو اپنے نظریۂ حیات اور اپنی قائدانہ صلاحیت دونوں پہ پورا الیقین تھا۔ وہ قوم کی مخالفت اور ناخوشی سے نہ ڈرے بلکہ انہوں نے بچھڑے کے بُت کو جو دولت اور توہّم پرستی کی علامت تھا، توڑ ڈالا، سامری کی قیادت کے طلسم کو درہم برہم کر دیا۔ اور قوم کو راہِ راست پہ لے آئے۔ انہوں نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ قائد کا فرض قوم کی رہنمائی کرنا ہے تقلید کرنا نہیں ہے۔

اس داستان میں ہمارے لئے بھی بڑی نشانیاں موجود ہیں۔ کیونکہ پاکستانی قوم بھی ان دنوں بھانت بھانت کے سامری فن رہنماؤں کی سحر طرازیوں کا شکار ہے۔ سونے کے بچھڑے نے کہیں دولت وجاہ اور اختیار واقتدار کی شکل اختیار کر لی ہے اور کہیں وہ پرانے توہّمات وتعصّبات کے روپ میں ظاہر ہو رہا ہے۔ بنیادی مسائل پر سنجیدگی سے غور و فکر کرنے اور ان کا معقول حل تلاش کرنے کے بجائے عوام کے جذبات کو مشتعل کیا جاتا ہے اور وہ حضرات جن کو موسیٰؑ زماں بننے کی ہوس ہے قیادت کی ذمہ داریوں کو فراموش کر چکے ہیں، اور سستی مقبولیت کی خاطر ہر اچھے بُرے کام میں عوام کی ہاں میں ہاں ملانے ہی کو قومی خدمت تصور کر رہے ہیں

عوام پر پہلا حملہ، مہنگائی

انتخابات کے زمانے میں دائیں بازو کے لیڈروں نے عوام کے جذبات سے فائدہ اٹھانے کی بہتیرا کوششیں کی تھیں لیکن یہ کوششیں رائگاں گئیں۔ قوم نے عوامی لیگ اور پیپلز پارٹی کو بھاری اکثریت سے کامیاب کیا۔ اور وہ جنہوں نے سوشلزم کو زک دینے کے لئے اسلامی نظام کے حربے اختیار کئے تھے ہار گئے لیکن بائیں بازو کی فتح کو شکست میں بدلنے کی تیاریاں فوراً شروع ہو گئیں۔ چنانچہ سرمایہ داروں نے پہلا وار عوام کی جیبوں پر کیا اور اشیاء صرف کی قیمتیں بڑھا دیں، حالانکہ اس کا کوئی جواز نہ تھا۔ لوگ حیران تھے کہ انتخابات کے بعد ایسی کون سی آفت آئی جو اناج، گوشت اور گھی وغیرہ کے دام چڑھ گئے۔ یہ تشویش ناک صورت حال بائیں بازو کی قیادت کا پہلا امتحان تھی، اور عوام اُن رہنماؤں سے قیادت کی توقع کرنے میں حق بجانب تھے جن کو انہوں نے اپنا نمائندہ چنا تھا پیپلز پارٹی، عوامی لیگ اور نیشنل عوامی پارٹی کے لیڈروں نے سرمایہ داروں کے اس چیلنج کو اگر قبول کر لیا ہوتا اور میدان میں اتر آتے تو عوام کے حوصلے بلند ہوتے اور بائیں بازو کی ساکھ بھی بڑھ جاتی لیکن بائیں بازو نے یہ موقع ہاتھ سے جانے دیا۔ رہنماؤں نے اخباروں میں دھمکی آمیز بیانات ہی پر اکتفا کی اور یہ نہ سوچا کہ اخباری بیانات سے قیمتیں نہیں گرا کرتیں۔ اس کے لئے تو وسیع پیمانے پر عوامی تحریک چلانی پڑتی ہے۔ محلہ کمیٹیاں بنانا، جگہ جگہ جلسے کرنا اور جلوس نکالنا، آڑھتیوں اور سوداگروں کی دکانوں پہ پُرامن پکٹنگ کرنا، حکومت پہ دباؤ ڈال کر مجرموں کے خلاف تادیبی کارروائیاں کرنا، عوامی عدالتوں میں سماجی لٹیروں پہ نام بہ نام مقدمے چلانا، سستے سامانوں کی دکانیں کھلوانا غرضیکہ عوامی جدوجہد کی رفتار کو تیز کرنے اور اس کی سطح کو بلند کرنے کے بہت سے کام تھے جن پر کسی نے توجہ نہ دی۔ بائیں بازو کی قیادت پہلے امتحان میں ناکام ہو گئی۔

پھر کتاب کا شوشہ چھوڑا گیا

بائیں بازو کی قیادت کی اس کوتاہی اور بے عملی سے دائیں بازو نے خوب فائدہ اٹھایا۔ چنانچہ رجعت پرستوں نے اب کے ایک نیا شوشہ چھوڑا۔ یہ تھی ایک کتاب جس میں رسول اللہ صلعم کی شان میں گستاخی کی گئی تھی۔ یہ کتاب مدت گذری برطانیہ یا امریکہ میں شائع ہوئی تھی۔ پاکستان میں نہ کبھی درآمد ہوئی اور نہ بکی البتہ جماعت اسلامی کے گرگوں کو یہ کتاب کہیں سے ہاتھ لگ گئی اور انہوں نے بات کا بتنگڑ بنا دیا۔ جماعت اسلامی نے چالاکی یہ کی کہ ابتداً کھل کر سامنے نہیں آئی ورنہ لوگوں کو اس مہم کی اصل غرض وغایت کا علم ہو جاتا۔ اس نے پہلے اخباروں میں خبر چھپوائی پھر جمعیتہ طلبا کو اشارہ کر دیا۔ طلبا نے جلوس نکالے، توڑ پھوڑ کی گئی۔ دکانیں لوٹی گئیں بسیں جلائی گئیں اور کتاب کے خلاف باقاعدہ مہم شروع ہو گئی۔ بائیں بازو کے بعض رہنماؤں نے یہ سمجھ کر کہ یہ بھی کوئی "عوامی تحریک" ہے فوراً بیانات کا سلسلہ شروع کر دیا کہ مبادا اُن کی مقبولیت میں فرق آجائے۔ ایک بزرگ نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اگر برطانیہ معافی نہ مانگے تو ہمیں برطانیہ سے سفارتی تعلقات توڑ لینے چاہئیں۔ اس شور وغل کو ایک ہفتہ گذرا تب یہ عقدہ کھُلا کہ یہ سب کچھ جماعت اسلامی کی سازش تھی۔

اسی اثنا میں خبر آئی کہ عالمی ہاکی کپ کا پہلا میچ لاہور میں ہوگا اور دنیا کی دوسری ٹیموں کے علاوہ ہندوستان کی ہاکی ٹیم بھی اس میچ میں شریک ہوگی جو پاکستان ہاکی فیڈریشن کی دعوت پر لاہور میں کھیلا جانے والا تھا۔ لیکن بائیں بازو کی ایک جماعت کو جس کی خارجہ پالیسی کی بنیاد ہندوستان سے نفرت اور عداوت پر قائم ہے یہ منظور نہ تھا چنانچہ پارٹی کے لیڈروں نے اعلان کیا کہ ہم ہندوستانی ٹیم کو پاک سرزمین پر قدم نہ رکھنے دیں گے۔ پارٹی کے اخباروں نے مصرع اس زور و شور سے اٹھایا کہ میچ کے منتظمین کے دل دہل گئے۔ بعض لال بجھکڑوں نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ ہو نہ ہو یہ میچ اعلان تاشقند کا شاخسانہ ہے اور ہندوستان پاکستان کے کانفیڈریشن کی سازش کی ایک کڑی ہے۔ اس پر ہمیں اس دانائے راز کا قصہ یاد آگیا جس نے ہاتھی کے پاؤں کے نشان دیکھ کر کہا تھا کہ ہرن نے پاؤں میں چکی باندھ کر چھلانگ لگائی ہوگی۔

ہاکی کے شیدائیوں کا کہنا تھا کہ اچانک کون سا ماجرا ہوا جو ہندوستان کی ہاکی ٹیم کا داخلہ بند کر دیا جائے۔ ہماری ہاکی ٹیم ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد ٹوکیو اور بنکاک میں ہندوستانی ٹیم سے کھیل چکی ہے۔ ابھی حال ہی میں کرکٹ کے دو ہندوستانی کھلاڑیوں نے کراچی کے ایک میچ میں شرکت کی تھی۔ یوں بھی ہندوستان سے ہر سال سینکڑوں سکھ یاترا کرنے یہاں آتے ہیں پھر ہندوستان کا پورا سفارت خانہ یہاں موجود ہے۔ اگر ان لوگوں کی وجہ سے پاک سرزمین نجس نہیں ہوتی تو ہاکی کے ایک درجن کھلاڑیوں نے کیا قصور کیا ہے جو ان کو روکا جا رہا ہے لیکن یہ دلیلیں جذبات کے سیلاب میں بہہ گئیں۔ ہاکی میچ منسوخ ہو گیا۔ اور کسی لیڈر کو جرأت نہ ہوئی کہ عوام کو سمجھاتا کہ ان طفلانہ حرکتوں سے باز آئیے اور بالغ انسانوں کی طرح دنیا میں رہنے کا قرینہ سیکھئے۔ ہندوستان سے ہمارے لاکھ اختلافات سہی مگر ہر بات کا ایک موقع اور محل ہوتا ہے ہندوستانی کھلاڑیوں کو منع کرنے سے ہندوستان کا کچھ نہ بگڑا۔ البتہ دوسرے ملکوں کے لوگ ہم پر ہنسے اور ہمارا مذاق اڑایا گیا۔ لیڈروں نے ایک بار پھر قوم کی رہنمائی کرنے کے بجائے تقلید کرنے پہ اکتفا کی۔ جنون ایک بار پھر عقل پہ غالب آیا۔

لیڈروں کا چوتھا اِمتحان

بائیں بازو کے لیڈروں کا چوتھا امتحان سندھ میں شروع ہوا۔ یہاں دائیں بازو کے دو گروہ عرصے سے آپس میں نبرد آزما ہیں۔ ایک گروہ کی قیادت پنجابی پٹھان مہاجر متحدہ محاذ کے ہاتھ میں، اور دوسرے کی سندھ متحدہ محاذ کے ہاتھ میں چنانچہ گذشتہ سال اس جھگڑے نے بڑے پیمانے پہ آتش زنی اور خون خرابے کی شکل اختیار کر لی تھی۔ ان دونوں گروہوں کا مقصد قومی اور صوبائی انتخابات میں کامیابی تھا اور وہ نئے اور پرانے سندھیوں کو آپس میں لڑا کر اپنا اُلو سیدھا کرنا چاہتے تھے۔ افسر شاہی کبھی ایک گروہ کو شہ دیتی اور کبھی دوسرے گروہ کی پیٹھ ٹھونکتی تھی۔ لیکن ان کے سارے منصوبوں پر پیپلز پارٹی نے پانی پھیر دیا۔ انتخابات ہوئے تو پتہ چلا کہ سندھ کے عوام علاقائی تعصبات سے ہنوز محفوظ ہیں۔ انہوں نے دائیں بازو کے دونوں گروہوں کی قیادت کو رد کر دیا۔ اور بڑی تعداد میں پیپلز پارٹی کے حق میں ووٹ دیا۔

ہندوستانی طیّارے کا قضیہ

پیپلز پارٹی کی فتح سے یہ امید بندھی تھی کہ شاید نئے اور پرانے سندھی کی نزاع اب ختم ہو جائے لیکن دایاں بازو ہارنے کے بعد نچلا نہیں بیٹھا بلکہ اس نے سندھ میں اردو سندھی کا جھگڑا از سر نو کھڑا کر دیا ہے۔ اب ایک طرف مسٹر جی ایم سیّد اور ان کے ہم صفیر ہیں اور دوسری طرف نواب مظفر خاں اور ان کے ہمنوا ہیں۔ اور چکی کے ان دو پاٹوں کے بیچ میں اردو اور سندھی دونوں زبانیں پس رہی ہیں۔

اس لسانی نزاع نے جنوری میں بڑی تشویشناک صورت اختیار کر لی۔ جھگڑے ہوئے، لاٹھیاں برسیں، طلبا گرفتار کئے گئے۔ درس گاہیں بند ہوئیں۔ سندھ یونیورسٹی کے بعض شعبوں میں آگ لگائی گئی اور کتابیں اور مخطوطات نذر آتش کر دیئے گئے۔

توقع تھی کہ پیپلز پارٹی اس مسئلے کا کوئی معقول حل نکالے گی اور عوام کی رہبری کرے گی لیکن معلوم ہوا کہ وہاں بھی وحدتِ فکر مفقود ہے اور لیڈر حضرات طرح طرح کی بولیاں بول رہے ہیں۔ یہ درست ہے کہ مسٹر بھٹو نے اپنے بیان میں پارٹی کا موقف بڑی وضاحت سے پیش کیا ہے لیکن ان کے بیان کے بعد بھی پیپلز پارٹی کے بعض لیڈر کچھ کہہ رہے ہیں اور بعض کچھ۔ ان بیانوں سے زبان کی گتھی سلجھنے کے بجائے اور پیچیدہ ہوتی جا رہی ہے۔

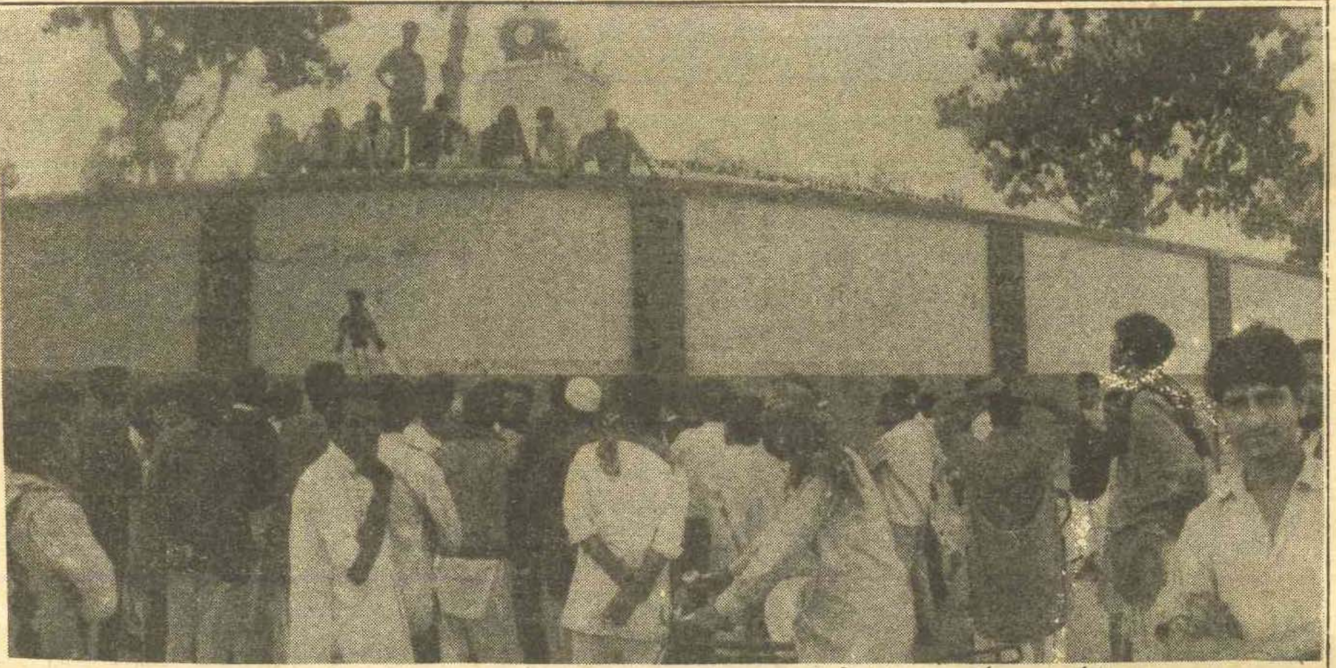
ابھی یہ نزاع جاری تھی (بلکہ ہے) کہ دو کشمیری مجاہد ایک ہندوستانی ہوائی جہاز اڑا کر لاہور لے آئے اور مغربی پاکستان کے جذبات میں ایک بار پھر اُبال آگیا۔ زندہ دلانِ لاہور نے مجاہدین کا خیر مقدم بڑی گرم جوشی سے کیا اور اخباروں نے ان کی شجاعت اور سرفروشی کو خوب خوب سراہا یہاں تک کہ مسٹر بھٹو نے بھی ان کے کارنامے کی تعریف کی اور ان سے مل کر ان کو مبارکباد دی۔ یہاں تک تو غنیمت تھا لیکن دوسرے دن ان نوجوانوں نے ہوائی جہاز کو آگ لگا کر برباد کر دیا۔ بعض لیڈروں نے اس حادثے کو بھی جہاد کشمیر سے تعبیر کیا اور نوجوانوں کی دلیری کی داد دی۔ اور یہ نہ سوچا کہ اس قسم کی حرکتوں کا ملک میں اور بیرون ملک کیا ردّ عمل لیا ہوگا۔ یہ نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔

غرضیکہ الیکشن کے بعد سے اب تک ملک میں پانچ ہنگامے ہو چکے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کا تعلق بھی عوام کے اُن بنیادی مسائل سے نہیں ہے جن کو حل کرنے کا بیڑا ہمارے لیڈروں نے اٹھایا ہے۔ ہم مانتے ہیں کہ لیڈروں کے لئے ان ہنگاموں سے بے تعلق رہنا ممکن نہ تھا لیکن سوال یہ ہے کہ کیا انہوں نے ہنگاموں میں شرکت کر کے لیڈری کے فرائض ادا کئے یا جدھر کی ہوا دیکھی ادھر ہی کو چل کھڑے ہوئے

مشہور انشا پرداز ابراہیم جلیس نے اپنے ایک کالم میں اصلی اور بناسپتی قائدوں کا فرق بیان کرتے ہوئے دکن کے انقلابی شاعر اور سیاسی رہنما مخدوم محی الدین کا ایک واقعہ تحریر کیا ہے۔ وہ روایت کرتے ہیں کہ ایک بار بمبئی میں مزدوروں کی زبردست ہڑتال ہوئی۔ ہڑتال نے طول کھینچا، حکومت نے دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی۔ مزدوروں نے دفعہ ۱۴۴ توڑ دی۔ اور پریل کے میدان میں جمع ہو گئے۔ پولیس جب معمولی لاٹھیوں اور بندوقوں سے مسلح ہو کر موقع پر پہنچ گئی۔ اس پر مزدور مشتعل ہو گئے اور مجمع قابو سے باہر ہونے لگا۔ مزدور لیڈر ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ مزدوروں کا خون بیکار بہے لیکن کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ لاکھ سوا لاکھ کے ہجوم سے منتشر ہو جانے کی اپیل کرے۔ تب مخدوم محی الدین اسٹیج پہ آئے۔ انہوں نے مزدوروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ بھائیو، بتائیے آپ لوگ مجھ پہ بھروسہ کرتے ہیں یا نہیں۔ پورے مجمع نے یک آواز ہو کر کہا کہ بھروسہ کرتے ہیں۔ مخدوم نے پھر پوچھا آپ مجھے اپنا دوست سمجھتے ہیں یا دشمن۔ مزدوروں نے نعرہ لگایا دوست۔ تب مخدوم نے جیب سے گھڑی نکالی اور کہا کہ میری درخواست ہے کہ آپ پانچ منٹ کے اندر اندر منتشر ہو کر اپنے اپنے گھروں کو چلے جائیں۔ پریل کا میدان پانچ منٹ کے اندر خالی ہو گیا۔

سچّے اِنقلابی کا طرزِ عمل

سچے رہنما کو اپنے فلسفۂ زیست اور مسلک و مقصد پر کامل یقین کے ساتھ اپنی ذات پر بھی پورا اعتماد ہوتا ہے۔ وہ زہر ہلاہل کو کبھی قند نہیں کہتا اور نہ خوفِ فسادِ خلق سے لوگوں کی ہاں میں ہاں ملاتا ہے۔ وہ گھر کی رونق بڑھانے کی خاطر ہنگامے کھڑے نہیں کرتا بلکہ عوام کو اُن ہنگاموں سے بچاتا ہے جن سے حصول مقصد میں خلل پیدا ہو۔ وہ ہر قدم اٹھانے سے پیشتر یہ سوچتا ہے کہ میرے طرزِ عمل سے عوام کا شعور بلند ہوگا یا نہیں، اُن کی جد و جہد کی سطح اونچی ہوگی یا نہیں، ان کی قوت مقابلہ بڑھے گی یا نہیں، ان میں انقلاب کا جذبہ تیز ہوگا یا نہیں، اگر جواب اثبات میں ہوتا ہے تو وہ اپنے ذاتی مفاد کی پروا کئے بغیر میدان میں کود پڑتا ہے۔ اگر جواب نفی میں ہوتا ہے تو وہ عوام کے جوش اور جذبے کی پروا کئے



مزدور رہنما ملز کی دیوار پر کھڑے ہو کر نیچے کھڑے ہوئے اخبار نویسوں سے بات چیت کر رہے ہیں

کارخانے میں قانون کس کا چلتا ہے، سیٹھ کا یا پولیس کا؟

ولیکا ملز میں مزدوروں پر کیا گزری؟

نمائندہ خصوصی

یہ ۱۲ فروری کا ذکر ہے، صبح کا وقت تھا۔

ولیکا گروپ آف انڈسٹریز کے تین ہزار مزدوروں نے ولیکا ٹیکسٹائل مل، ولیکا وولن مل اور ولیکا آرٹ فیبرک کے اندر داخل ہو کر کارخانوں کے دروازے مزدور دشمن سرمایہ داروں پر بند کر دیئے اور تینوں ملوں کا انتظام خود سنبھال کر ولیکا کے مالکان کا یہ دعویٰ رد کر دیا کہ اُن کی ملز پر پاکستان کا نہیں بلکہ ولیکا کا جھنڈا لہراتا ہے اور وہاں اُن کا اپنا قانون چلتا ہے۔

مزدوروں نے ملز پر قبضہ کرنے کے بعد سب سے پہلے مشینوں کی صفائی کی۔ خراب مشینوں کو درست کیا۔ ٹیکسٹائل مل میں بجلی کا نظام درست کیا جسے سرمایہ داروں نے چند دن پہلے جان بوجھ کر خراب کر دیا تھا اُس کے بعد پُرامن اور منظم طریقے سے کام شروع کیا گیا۔ اس ۱۸ گھنٹے کے قبضے کے دوران میں کسی مشین یا املاک کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا گیا (جس کا اعتراف بعد میں مالکان نے بھی کیا) کیونکہ اِس قبضے سے مزدوروں کا مقصد اپنے مطالبات منوانے کے سوا کچھ اور نہ تھا۔

اسی دن ولیکا ورکرز یونین کے صدر جناب فیض اللہ خاں نے ملز کی دیوار پر بیٹھ کر اخباری نمائندوں کو مزدوروں کے مطالبات سے آگاہ کیا۔ ان کے مطالبات مختصراً یہ تھے:-

گذشتہ سال کی ہڑتال کے بعد جیل سے رہا ہونے والے مزدوروں کو کام پر واپس لیا جائے۔

غیر ہنر مند مزدوروں کو سرکاری ضابطے کے مطابق کم از کم ایک سو چالیس روپے تنخواہ دی جائے۔

ٹیکسٹائل میں کام کرنے والے مزدوروں کو مِل مالکان ایسوسی ایشن کے اعلان کے مطابق ۴۰ پیسے یومیہ حاضری الاؤنس دیا جائے۔

کراچی کینٹین رولز کے تحت کینٹین کی حالت بہتر بنائی جائے اور اچھی اشیائے خوردنی بلا منافع مناسب قیمت پر مُہیا کی جائیں۔ اسکے علاوہ مالکان نے جتنے دن ٹیکسٹائل مل میں جان بوجھ کر بجلی بند رکھی اُن دنوں کی اُجرت بھی ادا کی جائے۔

یونین کی مجلس عاملہ کے دو اراکین جناب میر دولت اور بدر الدین کو رہا کرایا جائے جنہیں بجلی کے نظام میں گڑبڑ کا جھوٹا الزام لگا کر گذشتہ روز گرفتار کرایا گیا تھا، علاوہ ازیں ۵ دسمبر ۱۹۶۹ء کے معاہدہ کی دیگر دفعات پر بھی پوری طرح عمل کیا جائے۔

سوال یہ ہے کہ وہ کون سے حالات تھے جن کے تحت مزدوروں کو ایسا قدم اٹھانے کی ضرورت پیش آئی۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے ہمیں اکتوبر ۱۹۶۹ء میں ولیکا کے مزدوروں کی ۴۷ روزہ ہڑتال اور اس کے پس منظر کا مختصراً جائزہ لینا ہوگا۔ اس کے بعد ہی ۵ دسمبر ۱۹۶۹ء کو حکام کی کوشش سے فریقین کے مابین ایک باقاعدہ معاہدہ ہوا تھا۔ جس کے تحت مندرجہ بالا مطالبات مالکان نے تسلیم کر لئے تھے مگر ان پر آج تک پوری طرح عملدرآمد نہیں کیا گیا۔

ولیکا کے مزدوروں نے
پاکستان کے مزدوروں کو
ایک نئی راہ دکھائی ہے

بغیر اُن کے اقدام کی مخالفت کرتا ہے اور اپنی مقبولیت اور شہرت کو خطرے میں ڈالنے سے گریز نہیں کرتا۔

ذرا رہنمائی کے اس معیار کو سامنے رکھئے اور گذشتہ چند ہفتوں میں جو واقعات ملک میں رونما ہوئے اُن کے پیش نظر ہمارے رہنماؤں کے طرزِ عمل و فکر کا جائزہ لیجئے۔ آپ یقیناً اسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ ہمارے رہنماؤں نے کسی ایک موقع پر بھی سچی رہنمائی کے تقاضے پورے نہیں کئے۔ انہوں نے نہ تو عوام کی سیاسی تربیت کی ہے اور نہ ان کے تعصبات اور توہمات کی اصلاح پر توجہ دی ہے بلکہ اُلٹے اپنے طرزِ عمل سے ان رُجحانات کی حوصلہ افزائی کی ہے جو عوام کے حق میں مضر ہیں اور اُن کے مفاد کو تقویت نہیں پہنچاتے۔

مزدوروں نے یہ ماننے سے انکار کر دیا کہ ملز کے اندر صرف ولیکا کا جھنڈا لہرا سکتا ہے

ولیکا کے مالکان اپنی مزدور دشمنی کے لئے مدتوں سے بدنام چلے آتے ہیں۔ ملک کے بااثر سرمایہ دار ہونے کی وجہ سے انہوں نے اپنے ہاں مزدوروں کو ٹریڈ یونین کے تحت متحد ہو کر اپنے حقوق حاصل کرنے کی کبھی مہلت ہی نہیں دی۔ بلکہ وہ ہمیشہ فخر سے یہ بات مزدوروں کو بتاتے آئے ہیں کہ ان کی ملز کے اندر پاکستان کا جھنڈا نہیں بلکہ ولیکا کا جھنڈا لہراتا ہے اور یہاں پاکستان کا قانون نہیں چلتا بلکہ ولیکا کا قانون چلتا ہے۔

۱۹۶۹ء میں ایوب آمریت کی شکست سے مزدور طبقے کے حوصلے بلند ہوئے مگر ملک میں مارشل لار کے نفاذ کے باعث مزدور جدوجہد کچھ عرصہ معطل رہی۔ سرمایہ داروں نے ان حالات سے فائدہ اٹھایا۔ ولیکا برادران نے بھی حالات کو اپنے حق میں استعمال کرنے کی کوشش کی مگر اس وقت تک ولیکا کے مزدور، متحدہ مزدور فیڈریشن کی باشعور قیادت میں منظم ہو چکے تھے۔ لہٰذا جب مزدوروں نے نئی حکومت کے وعدوں کے مطابق اپنے حالاتِ کار اور شرائط ملازمت کی بہتری کے لئے تنظیم اور جدوجہد کا آغاز کیا تو ان سرمایہ داروں نے انتقامی کارروائی شروع کر دی۔ ردّعمل کے طور پر ولیکا ملز میں اکتوبر ۱۹۶۹ء میں دو مرتبہ ہڑتال ہوئی مگر مارشل لار حکام کی مداخلت سے دونوں مرتبہ معاملہ ٹل گیا۔

ٹریڈ یونین رہنماؤں کی گرفتاری

چند دنوں بعد ولیکا برادران نے ٹریڈ یونین سرگرمیوں میں حصہ لینے کی پاداش میں یونین کے چند سرگرم کارکنوں کو معطل کر دیا۔ ردِّعمل کے طور پر ۲۲ر اکتوبر ۱۹۶۹ء کو ان تینوں ملوں میں مکمل ہڑتال ہو گئی۔ یہ ہڑتال ۴۷ روز تک رہی۔ مارشل لار کے نفاذ کے بعد ملک بھر میں یہ پہلی ہڑتال تھی۔

ہڑتال شروع ہوتے ہی نوکر شاہی حسب معمول سرمایہ داروں کی خدمت کو آ دھمکی، بے شمار افراد کو گرفتار کر لیا گیا۔ جس میں یونین کے صدر فیض اللہ خان کے علاوہ تقریباً سبھی عہدیدار اور سرگرم کارکن شامل تھے۔ اسکے ساتھ ہی متحدہ مزدور فیڈریشن (جس کے ساتھ ولیکا کے مزدوروں کی یونین ملحق تھی) کے صدر عثمان بلوچ اور دیگر راہنماؤں شاہ رضا خان اور ظہیر اختر بیدی صاحب کو کئی مقدموں میں ملوث کر کے گرفتار کر لیا گیا۔ ان سب ہتھکنڈوں کے باوجود مزدوروں کے اتحاد میں کمزوری نہیں آئی۔ اور نہ صرف ولیکا ملز میں ہڑتال کامیابی سے جاری رہی بلکہ صنعتی علاقے کے بیشتر ٹیکسٹائل ملوں میں بھی ولیکا ملز کے مزدوروں کی حمایت اور گرفتار شدگان کی رہائی کے مطالبے کی خاطر ہڑتالوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔

بالآخر کراچی کی انتظامیہ اور ولیکا کے سرمایہ داروں نے چند مزدور دوست شہریوں کی وساطت سے باقی ماندہ مزدور کارکنوں اور فیڈریشن کے نمائندوں سے رابطہ قائم کیا اور یقین دلایا کہ مالکان یونین کے مطالبے تسلیم کرنے کو تیار ہیں۔ اور جب حالات معمول پر آ جائیں گے تو گرفتار شدگان کو بھی رہا کر دیا جائے گا۔

ملز کے مالکوں نے معاہدہ کر لیا

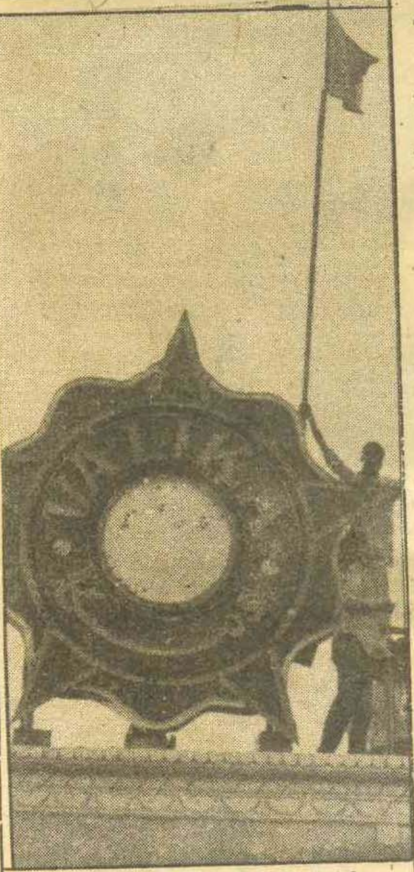
۵ر دسمبر ۱۹۶۹ء کو محکمۂ صنعت کے عہدیداروں کی موجودگی میں یونین اور مالکان کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس میں مزدوروں کے ۲۳ مطالبات تسلیم کر لئے گئے تھے ان میں دورانِ ہڑتال معاوضہ کی ادائیگی سالانہ بونس اور چھٹیوں کی منظوری اور وہ تمام مطالبات شامل تھے جن کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے لیکن جن پر عمل درآمد کرانے کی خاطر آج بھی مزدوروں کو جدوجہد کرنی پڑ رہی ہے۔ مالکان نے اس معاہدے پر نہ تو پوری طرح عمل کیا اور نہ مقامی انتظامیہ نے گرفتار شدگان کی رہائی کے لئے کوئی قدم اٹھایا یونین کے صدر فیض اللہ، نائب صدر محمد خان۔ جنرل سیکریٹری بختیار، اور سینئر خزانچی شاہ نذیر کو چھ چھ ماہ اور یونین کی مجلسِ عاملہ کے دس اراکین کو تین تین ماہ قید بامشقت ہو گئی۔ فیڈریشن کے صدر عثمان بلوچ اور شاہ رضا خاں کو ایک ایک سال اور ظہیر اختر بیدی صاحب کو چھ ماہ قید بامشقت ہوئی (شاہ رضا خاں کو ۱۲ کوڑوں کی سزا بھی سنائی گئی تھی مگر بعد میں اس پر عمل درآمد روک دیا گیا تھا) یہ تمام کارکن اپنی سزائیں پوری کر کے جیل سے رہا ہوئے صنعتی علاقے کی دوسری ملوں کے مزدوروں پر مالکان، انتظامیہ اور پولیس کا تشدد، گرفتاریاں اور چھانٹی، یہ ایک الگ داستان ہے۔

فیڈریشن اور یونین کے راہنماؤں اور سرگرم کارکنوں کی گرفتاری اور سزایابی کے باوجود مزدوروں نے حالات کا پامردی سے مقابلہ کیا۔ اس دوران میں سرمایہ داروں نے ان پر ظلم اور زیادتی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ معاہدے کے مطابق ہڑتال کے دنوں کا معاوضہ۔ اور سالانہ بونس حتیٰ کہ ہڑتال سے پہلے کے رُکے ہوئے واجبات وغیرہ دینے میں انہوں نے خاصے لیت ولعل سے کام لیا اور کئی ماہ مزدوروں کو تنگ کرتے رہے۔ بلکہ قانونی موشگافیوں کے ذریعے قدم قدم پر مزدوروں کو دھوکہ دیتے اور قانون کا مذاق اڑاتے رہے۔

مارشل لار حکومت کے اعلان کے مطابق غیر ہنر مند مزدوروں کو ۱۴۰ روپے کی بنیادی تنخواہ نہ دینے کی خاطر یہ لوگ مزدوروں کی بے روزگاری اور بے کسی سے فائدہ اٹھاتے رہے اور انہیں ایک سو روپے ماہوار پر اپرنٹس بھرتی کرتے رہے۔ مگر انہیں ترقی دے کر ہنر مند مزدور تو کیا غیر ہنر مند مزدور کی حکومت کی طرف سے مقرر کردہ تنخواہ نہیں دیتے تھے۔ جو مزدور پہلے سے ملازم تھے انہیں چھانٹی کر کے نکال دیا یا بے شمار مزدوروں کو ڈیوٹی پر پہنچنے کے بعد یہ کہہ کر واپس کرتے رہے کہ آج کام نہیں ہے مشین خراب ہے یا خام مال موجود نہیں ہے، بیشتر مزدور اس مسلسل نیم بیروزگاری سے تنگ آ کر کہیں اور نوکری کی تلاش میں چلے جاتے۔ اس کے علاوہ مل مالکان مل کے اندر اپنے ہی ملازم سپروائزروں کو بعض کام ٹھیکے کے طور پر دے دیتے اور وہ ٹھیکیداران مزدوروں کو روزانہ کام کے حساب سے اجرت دیتے جس سے مزدوروں کو بہت کم اجرت ملتی۔

اور معاہدے سے منحرف ہو گئے

۵ر دسمبر ۶۹ء کے معاہدے کے تحت مالکان نے تسلیم کیا تھا کہ وہ اپٹما ایسوسی ایشن کے اعلان کے مطابق ٹیکسٹائل کے ہنر مند مزدوروں کو ۴۰ پیسے یومیہ کے حساب سے حاضری الاؤنس دیں گے۔ مگر بجائے اسکے کہ وہ ایک بند دار



مزدور ملز پر یونین کا جھنڈا لہرا رہے ہیں

مزدوروں کی مصیبت خبر نہیں بنتی، لیکن ملز پر قبضہ، بی بی سی کیلئے بھی ایک بڑی خبر ہے

میں کسی ایک دن کی غیر حاضری پر صرف ایک دن کا حاضری الاؤنس کاٹتے انہوں نے ایک دن کی غیر حاضری پر پورے پندرہ دن کا حاضری الاؤنس کاٹنا شروع کیا، حالانکہ اکثر اوقات وہ خود اپنی مجبوری کے تحت مزدوروں کو کام سے واپس کرتے تھے۔ اس طرح مزدور کی یومیہ اجرت بھی ہاتھ سے جاتی اور پورے پندرہ روز کا حاضری الاؤنس بھی۔

دس سالانہ چھٹیوں کے لئے مزدوروں اور مالکوں کے باہمی معاہدے میں کوئی ایسی شرط شامل نہ تھی کہ سال بھر میں ۲۶۵ دنوں کی حاضری لازمی ہے مگر بعد میں مالکان نے مزدوروں کو چھٹیاں نہ دینے کی خاطر اپنے طور پر یہ شرط لگائی کہ جو مزدور سال میں ۲۶۵ دن حاضر رہے ہوں گے صرف ان ہی کو دس سالانہ چھٹیاں مل سکیں گی۔

کینٹین کے بارے میں یہ طے پایا تھا کہ مل کی کینٹین کو کراچی رولز کے تحت بہتر بنایا جائے گا اس میں مناسب صفائی کا انتظام کیا جائے گا اور اسے بلا منافع چلایا جائے گا مگر ان باتوں پر بھی عمل نہ کیا گیا کینٹین آج بھی اس حال میں ہے کہ کوئی انسان عام حالات میں وہاں بیٹھنا بھی گوارا نہ کرے یہاں کھانے میں انتہائی ناقص اور مضر صحت چیزیں ملتی ہیں۔

مزدوروں سے انسانیت سوز سلوک

مزدوروں کے ساتھ عام طور پر سرمایہ داروں اور ان کے عملے کا رویہ اتنا انسانیت سوز ہوتا ہے کہ انہیں الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے لیکن ولیکا برادران کے مظالم کی فہرست میں یہ بات شامل ہے کہ انہوں نے ان تمام مزدوروں اور مزدور کارکنوں کو کام پر واپس لینے سے انکار کر دیا جو تین ماہ چھ ماہ کی قید سے رہا ہو کر واپس آئے ہیں عذر یہ پیش کیا گیا کہ یہ لوگ مارشل لا کے سزا یافتہ ہیں اور ہم سزا یافتہ افراد کو ملازمت پر بحال نہیں کرتے، حالانکہ مارشل لا کی طرف سے ان پر ایسی کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی تھی۔ یہ کارکن کوئی اخلاقی مجرم نہیں تھے بلکہ انہوں نے اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے پولیس کی زیادتیاں برداشت کیں جس کے صلے میں انہیں جیل جانا پڑا مگر جیل سے رہائی کے بعد بھی ان کی سزا کی مدت ختم نہیں ہوئی اور سرمایہ داروں نے ان پر ملازمت کے دروازے بند کر کے انہیں مستقل بے روزگاری کا شکار کر دیا۔ بہرحال یہ لوگ کبھی محکمۂ محنت کے چکر کاٹتے رہے کبھی عدالتوں کے دروازے کھٹکھٹاتے رہے مگر ان کی کسمپرسی روز بروز بڑھتی گئی۔

۵۔ دسمبر ۱۹۷۰ء سے مزدور اور ملز کی انتظامیہ کے باہمی معاہدہ کا دوسرا سال شروع ہوا۔ لہٰذا مزدوروں نے اپنے دیرینہ مطالبات کے لئے پھر جدوجہد کا آغاز کیا تاکہ معاہدے کے مطابق سالانہ بونس اور چھٹیاں وغیرہ بھی حاصل کی جائیں اس دوران میں مالکان نے بھرپور کوشش کی کہ مزدوروں میں تفریق پیدا کر کے ان کے اتحاد کو توڑا جائے۔ چونکہ ولیکا ٹیکسٹائل اور ولیکا وولن وغیرہ ایک ہی چار دیواری کے اندر واقع ہیں اس لئے ان سب میں داخلے کے لئے ایک ہی بڑا آہنی گیٹ ہے جسے اس کی ہیبت کی رعایت سے عموماً سومنات کا مندر کہا جاتا ہے مالکان نے ٹیکسٹائل اور وولن ملز کے درمیان ایک دیوار کھڑی کی اور ایک نقلی دروازہ بنا کر وولن ملز کے مزدوروں کو الگ کرنے کی کوشش کی مگر مزدور اس چال کو پوری طرح سمجھتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے انتظامیہ کی یہ بات ماننے سے انکار کر دیا۔ انتظامیہ نے اس معاملے میں سختی سے کام لینا چاہا لیکن مزدوروں کے اتحاد کے اس مظاہرے کے سامنے انہوں نے گھٹنے ٹیک دیئے اور مزدوروں کی بڑے گیٹ سے آمد و رفت بحال کر دی

مسلسل اشتعال انگیزی

۱۹۶۹ء کی ہڑتال کی وجہ سے ولیکا برادران کے ذہن میں ایک بات بیٹھ چکی تھی کہ یہ سب "گڑبڑ" کھڈیاں چلانے والے مزدور کرتے ہیں۔ اس ہڑتال کے فوراً بعد انہوں نے وہ شعبہ ہی بند کر دیا۔ جس سے سینکڑوں مزدور بے روزگار ہو گئے تھے۔ مگر محکمہ محنت یا حکومت نے اس میں بھی ایسا کرنے سے روکنے کی کوئی کوشش نہ کی تھی بہرحال سوت بنانے کی مشین ابھی تک چل رہی تھیں۔ شاید انہیں کپڑے کے مقابلے میں صرف سوت بنا کر بیچنے میں زیادہ نفع ہوتا ہے

معاہدے پر عمل درآمد کرانے کے لئے مزدوروں کو کسی ہڑتال یا نوٹس دینے کی ضرورت نہیں تھی لہٰذا جب مالکان نے اس پر عمل کرنے میں پھر لیت و لعل سے کام لیا تو مزدوروں نے ان پر پُرامن ذرائع سے دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ اس بات پر مالکان نے یہ بہانہ بنایا کہ مزدور سستی سے کام کر رہے ہیں۔ لہٰذا انہوں نے عید سے ایک دن پہلے ۶ فروری کو ٹیکسٹائل مل کی بجلی بند کر دی اور یہ کہا کہ بجلی کی لائن خراب ہو گئی ہے۔ حالانکہ اسی لائن سے یہاں سے کافی دور ولیکا سیمنٹ اور ولیکا کیمیکل کو پائپ لائن کے ذریعے پانی کی فراہمی جاری تھی۔ جب مزدوروں کو یہ علم ہوا تو انہوں نے انتظامیہ سے مطالبہ کیا کہ وہ ان کی بجلی بحال کر کے انہیں بے روزگاری سے بچائے۔ مزدوروں کے احتجاج پر انتظامیہ نے متعدد مزدور نمائندوں کے خلاف مقدمہ درج کرا دیا کہ انہوں نے بجلی کا نظام خراب کر دیا ہے جس سے ولیکا سیمنٹ اور ولیکا کیمیکل کو پانی کی سپلائی رک گئی ہے اس طرح اسے مزید نقصان ہوا ہے۔

جمعہ (۱۲۔ فروری) کو یونین کے دو اراکین میر دولت اور بدر الدین کو گرفتار کر لیا گیا۔ رد عمل کے طور پر اگلے دن یعنی ۱۳ فروری کو جب صبح کی شفٹ کے لئے مزدور مل میں داخل ہوئے تو انہوں نے اپنے پیچھے گیٹ بند کر دیئے اور مل میں موجود انتظامیہ کے عملے کو باہر نکال کر تینوں ملوں کا انتظام خود سنبھال لیا۔

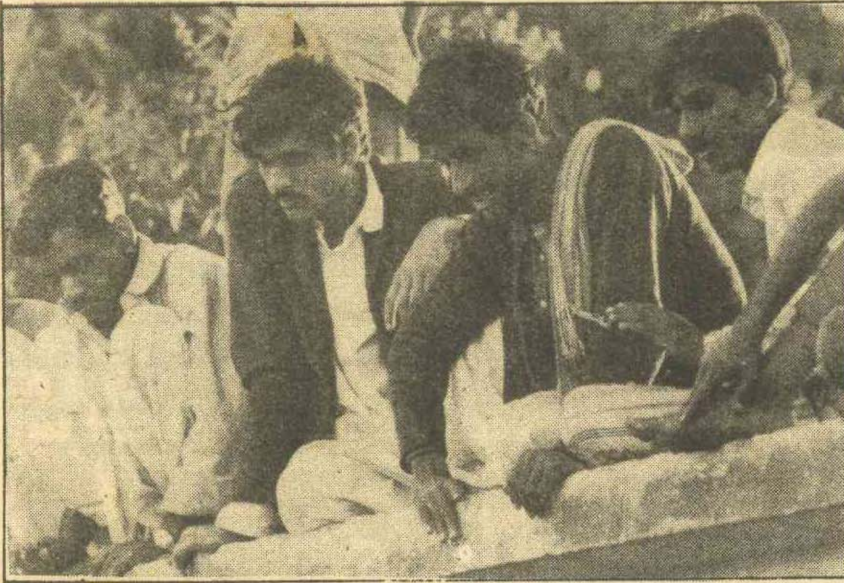
سرمایہ داروں کی طرف سے جب ان مزدوروں پر ملازمت کے دروازے بند کئے گئے تو اس کی خبر کسی ملکی اخبار میں بھی جگہ نہ پا سکی اور نہ ایک سال تک ان کے مصائب و آلام سے حکام اور عوام باخبر ہو سکے لیکن جب ان مزدوروں نے مزدور دشمن سرمایہ داروں پر ان کی ملوں کے دروازے بند کر دیئے تو ملکی اخبارات میں شہہ سرخیوں سے اس کا اعلان ہوا۔ یہاں تک کہ برطانوی نشری ادارہ بی بی سی سے بھی یہ خبر نشر ہوئی کہ ان ملوں پر مزدوروں نے قبضہ کر کے انتظام خود سنبھال لیا ہے۔

جب پولیس ملز میں داخل ہوئی

اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ مزدوروں کے خلاف اس ملک کے سرمایہ داروں اور نوکر شاہی کے شرمناک گٹھ جوڑ کی مکروہ ترین مثال ہے۔

بجائے اس کے کہ حکام بالا ان واقعات اور اسباب کی تحقیق کرتے جن کی وجہ سے مزدوروں کو ایسا قدم اٹھانے کی ضرورت پیش آئی اور معاہدے کی خلاف ورزی کی بنا پر مالکان سے بازپرس کیا جاتا۔ مسلح پولیس کی بھاری جمعیت نے رات گئے دو گھنٹے کی محنت کے ساتھ ملز کا آہنی گیٹ توڑا اور اندر گھستے ہی نہتے مزدوروں پر پل پڑے دروازہ کھولنے کے بعد مزدوروں نے اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کر دیا

ملز کی "سلامتی" پر ولیکا نے دو کالے بکرے صدقے کے طور پر ذبح کئے



مزدور کارکن ملز کی دیوار سے باہر لوگوں سے خطاب کر رہے ہیں

مگر پولیس نے ان پر زبردست لاٹھی چارج کیا اور آنسو گیس کے گولے پھینکے۔ اس کے علاوہ کئی مزدور کارکنوں کو بے رحمی سے زدو کوب کیا گیا۔ ڈیڑھ ہزار مزدوروں کو بسوں میں بھر کر لے جایا گیا۔ اور انہیں کسی طبی امداد دینے کی ضرورت بھی نہ سمجھی گئی۔ بیشتر کو یہ کہہ کر چھوڑ دیا گیا کہ انہوں نے معافی مانگ لی ہے تاہم آخری خبروں کے مطابق سات سو مزدوروں کے خلاف مقدمات درج کر لئے گئے ہیں ایک اور خبر کے مطابق مزدوروں پر درج ذیل الزامات کے تحت فرد جرم عائد کی گئی ہے۔

(۱) استحصال بالجبر (۲) مزاحمت بے جا۔ (۳) مداخلت بے جا۔ (۴) قفل شکنی (۵) بلوا (۶) دوسروں کو حبس بے جا میں رکھنا۔

آخری خبر یہ ہے کہ ولیکا کے مالکان نے ملز کے احاطہ میں دو کالے بکرے صدقے کے طور پر ذبح کئے کہ اللہ نے ان کی مل سلامت اور محفوظ رکھ لی۔

پٹھان کالونی میں جلسہ

۱۰ جنوری کو شام ۴ بجے عیدگاہ میدان پٹھان کالونی میں ایک جلسہ ہوا جس میں ولیکا ملز کے علاوہ دوسرے کئی کارخانوں کے مزدوروں نے بھاری تعداد میں شرکت کی جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے متحدہ مزدور فیڈریشن کے صدر عثمان بلوچ نے کہا کہ ولیکا ملز کے مزدوروں نے کوئی نیا مطالبہ انتظامیہ کو پیش نہیں کیا بلکہ مزدور صرف ان مطالبات پر عملدر آمد کا مطالبہ کر رہے ہیں جنہیں ولیکا کی انتظامیہ نے ۵ دسمبر ۱۹۶۹ء کے معاہدے میں تسلیم کیا ہے نجم الدین ولیکا نے اپنی پریس کانفرنس میں انتہائی غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے کہا ہے کہ مزدوروں نے انہیں مطالبات پیش نہیں کئے۔ عثمان بلوچ نے کہا کہ نہتے مزدوروں پر خصوصاً یونین کے صدر فیض اللہ خان نشار اور سراج پر پولیس نے جو تشدد کیا ہے وہ حکومت کی غیر جانبداری کے دعوؤں کی کھلی خلاف ورزی ہے بلوچ صاحب نے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا کہ جب بھی مزدور اپنے مطالبات کیلئے کوئی قدم اٹھاتے ہیں۔ انتظامیہ ڈنڈے اٹھا کر مزدوروں کے سروں پر پہنچ جاتی ہے اور بے گناہ مزدوروں سے جیلوں کو بھر دیا جاتا ہے لیکن مالکان جب اپنے تسلیم کئے ہوئے معاہدے سے پھر جاتے ہیں تو انتظامیہ کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔

نشاہ رضا خاں نے جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا ولیکا ملز کے جیالے مزدوروں نے ولیکا ملز پر اپنا سرخ پرچم لہرا کر پاکستان کے تمام مزدوروں کو ایک ایسی راہ دکھائی ہے جس پر چل کر ہی مزدور اپنے مسائل حل کر سکتے ہیں۔ شاہ رضا خان نے بتایا کہ ملز کے مزدوروں کی جدوجہد میں نہ صرف کراچی کے لاکھوں مزدوران کے ساتھ ہیں۔ بلکہ حیدرآباد لاہور اور دوسرے تمام صنعتی شہروں کے مزدور بھی ولیکا ملز کے مزدوروں کی حمایت کے لئے تیار ہیں۔ انہوں نے ولیکا کے مالکان کو متنبہ کیا کہ وہ نوشتہ دیوار پڑھ لیں۔ لاٹھیاں اور گولیاں انہیں زیادہ دیر تک نہیں بچا سکیں۔ وہ وقت دور نہیں جب مزدور ظالم مالکان سے ۲۳ سال کے دوران کئے جانے والے ایک ایک ظلم کا حساب لیں گے

جلسے سے خطاب کرتے ہوئے ولیکا ملز کے نکالے ہوئے مزدور مولانا عبدالخالق نے کہا نجم الدین ولیکا اگر یہ سمجھتا ہے کہ وہ پولیس کی مدد سے مزدوروں کو ڈرانے اور انہیں اپنے حقوق کی جدوجہد سے باز رکھنے میں کامیاب ہو جائے گا تو یہ اس کی بھول ہے۔ حق کو دبایا جا سکتا ہے۔ حق کو مٹایا نہیں جا سکتا۔ مولانا خالق نے مزدوروں سے اپیل کی کہ وہ امتحان کی اس سخت گھڑی میں اپنے اتحاد کو مضبوط رکھیں اور یہ ثابت کر دیں کہ انہیں اپنے حقوق کی جدوجہد سے کوئی نہیں روک سکتا۔ مولانا خالق نے پیپلز پارٹی کے رہنماؤں سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنے وعدوں کی لاج رکھنے کے لئے اس نازک وقت میں ولیکا ملز کے پانچ ہزار مزدوروں کی مدد کے لئے آگے بڑھیں اگر اس موقع پر مزدوروں کی نمائندگی کے دعویدار خاموش رہے تو آئندہ مزدوران کے کسی وعدے پر اعتبار نہیں کریں گے۔

جلسے کے دوران میں مزدوروں نے بار بار مزدور اتحاد زندہ باد سرمایہ داری مردہ باد، لاٹھی گولی کی سرکار نہیں چلے گی۔ مزدور کسان راج آکے رہے گا۔ کے فلک شگاف نعرے لگائے۔

خیال امروہوی
دانشگاہ تہران

برٹرنڈرسل کا گناہ

۳ر فروری کو برٹرنڈ رسل کی پہلی برسی منائی گئی

وہ مردِ شارحِ توراتِ عقل و فکرِ عمیق
امامِ عصرِ جدید و رسولِ عہدِ عتیق!
شعورِ نَو کے تقاضوں کا مطلع السعدین
خبر دہندۂ اسرار و حکمتِ دارَین
وہ ہمنوائے فلاطون و ہمسرِ سقراط
وہ رمز دانِ سبنوغ و فضیلتِ بقراط
ہمائے اَوجِ تعقل، عقابِ دشتِ کمال
جمالِ بزمِ تکلم، وقارِ استدلال
وہ بارگاہِ اُخوت کا بے بدل منشور
وہ فلسفے کی سند، نطق کا اَٹل دستور
حریفِ جہلِ عقائد، امینِ علمِ بشر
وہ شرق و غرب کا سب سے عظیم دانشور
خلوص و صلح کا قرنا صفائے دل کی نفیر
جبابرہ کی انا کے لئے کھلی شمشیر
گناہ اس کا یہی تھا کہ وہ بلند خیال
تمام عمر رہا مانعِ جدال و قتال
جدید فلسفۂ امن کے خلاف رہا
اسے سیاستِ دوراں سے اختلاف رہا
جہادِ حق کے لئے ملتوں کو اُکسایا
دلوں کو نغمۂ انسانیت سے گرمایا
بصد خلوص جزائر کی مدح خوانی کی
وفاقِ عالمِ انساں کی پاسبانی کی
سیاہ فام کو گورے کی ہمسری دیکر
تصوراتِ من و تو مٹا دیتے یکسر
"جہاں" کو ضد، کہ تعصب نہ کیوں دوامی ہو؟
نصیبِ آدمِ خاکی نہ کیوں غلامی ہو
نجات کیوں ہو بھلا آدمی کو ایٹم سے
نہ کیوں ہو جنگ زمانے میں جوہری بم سے
نہ کیوں ہو سام کا دُنیا میں طرزِ استعمار
نہ کیوں مدام ہلاکت کا گرم ہو بازار؟
وطن بدر نہ کئے جائیں کیوں فلسطینی
بقائے ذات کے خواہاں بھی کیوں ہوں لادینی
رہینِ جبر رہے کیوں نہ خطّہ کشمیر
نہ کیوں ہو پائے عرب میں یہود کی زنجیر
نہ کیوں جہاں میں میسّر ہو خواجگی کو دوام
اسیر کیوں نہ رہے سامراج کا دِیت نام
فسادِ دین سے برباد کیوں نہ ہو سنسار
ملوک کیوں نہ رہیں مفلسوں کے پالنہار
رسّل تھا کون جو دُنیا کو آگہی دیتا
جدید نسل کو تفہیمِ زندگی دیتا
وہ کون تھا جو نیا راستہ دکھا سکتا
چراغ اَمن کا آفاق میں جلا سکتا
یہ اور بات تبحّر میں فخرِ دوراں تھا
مگر مقام تو اس نابغہ کا زنداں تھا؟

”نسل پرست امریکی جہاں بھی غیر محفوظ ہوں، ہم سے امداد طلب کریں“

کوکلس کلاں دُنیا بھر میں گوروں کی ایمرجنسی پولیس بن گئی

کولمبیا یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کے پروفیسر رچرڈ ہارڈ کا کہنا ہے کہ ہم خوش نصیب ہوں گے اگر ہم امریکی معاشرے میں جدید طبقاتی تقسیم اور دائیں بازو کی انتہاپسندی کا پوری طرح شکار ہونے سے قبل موجودہ صورتِ حال سے بچ نکلیں۔ پروفیسر کا کہنا ہے ”مجھے یہ فکر نہیں کہ نوجوان یا نیگرو انقلاب برپا کرنا چاہتے ہیں بلکہ میں تو اس لئے پریشان ہوں کہ ہم ایک مشکل صورت حال کے شکنجے میں دھکیلے جا رہے ہیں۔ امریکی معاشرہ سرمایہ دارانہ ترقی کے ایک ایسے مرحلے میں داخل ہو گیا ہے جہاں پیش آنے والی دشواریوں پر کنٹرول کرنا اس کے بس سے باہر ہے۔

امریکہ کی نسل پرست خونخوار جماعت کوکلس کلاں کی قومی کانفرنس کی روئداد کو امریکی اخباروں نے خوب اچھالا ہے۔ کوکلس کلاں کے رہنما رابرٹ شیلٹن کا کہنا ہے کہ ان کی تنظیم امریکہ کے شمالی علاقے ہی میں نہیں بلکہ پورے امریکہ میں عوام کی حمایت حاصل کر رہی ہے۔ مسٹر شیلٹن نے صدر نکسن سے اپیل کی ہے کہ وہ اپنی ”امن عامہ“ قائم رکھنے کی داخلی پالیسی پر سختی سے کاربند رہیں موصوف نے صدر نکسن کو پیشکش کی ہے کہ اس پالیسی کی تکمیل میں جہاں کہیں ان کی خدمات درکار ہوں گی وہ اور ان کے رضاکار وہاں حاضر ہو جائیں گے۔ انہوں نے کہا جس علاقے میں گورے امریکی اپنے آپ کو غیر محفوظ پاتے ہیں۔ وہ ہمیں اپنی حفاظت کے لئے طلب کر سکتے ہیں۔!

صرف کلاں ہی امریکہ میں واحد فاشسٹ تنظیم نہیں بلکہ اور بہت سی جماعتیں ہیں، نیشنل وہائٹ پیپلز پارٹی، جو امریکن نازی پارٹی کے نام سے پہچانی جاتی ہے، پورے ملک میں سرگرم عمل ہے اس پارٹی کے ممبر نازیوں کا یونیفارم استعمال کرتے ہیں اور سواستیکا کا نشان بھی لگاتے ہیں۔ اس فاشی جماعت کا بنیادی کام پُرامن مظاہروں اور بائیں بازو کے عناصر پر حملہ کرنا ہے۔ ان امریکی نازیوں کا ہیڈ کوارٹر آرلنگٹن میں ہے۔ پچھلے سال یکم جولائی کو اس پارٹی کی طرف سے سنیٹ کے ارکان کو ٹیلیفون پر مندرجہ ذیل پیغام دیا گیا۔

”سینٹر میک گوران، نل برائٹ اور ہیٹفیلڈ اور ان کے حامیوں کو بندوق کی گولیوں کی ضرورت ہے (واضح رہے کہ مندرجہ بالا سینیٹر۔ ہند چینی وغیرہ میں امریکی پالیسیوں پر تنقید کرتے رہتے ہیں اور نسلی امتیاز کے خلاف ہیں۔)

یہ پیغام ولیم پائرز کی طرف سے دیا گیا خود کو نازی پارٹی کے نظریاتی رہنما کی حیثیت سے متعارف کراتے ہیں۔ ٹیپ ریکارڈ کے ذریعہ یہ پیغام سینٹ کے ممبروں کو پہنچایا گیا جب یہ پیغام سینٹ کے ارکان کو ملا تو اقلیتی پارٹی کے لیڈر مسٹر سکاٹ نے محکمۂ انصاف کو اس سے آگاہ کرنے کا مطالبہ کیا لیکن برسرِ اقتدار پارٹی نے اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔!

اس وقت سارا امریکہ فاشسٹ تنظیموں کے نفرت انگیز کتابوں اور رسالوں سے بھرا پڑا ہے۔ مثال کے طور پر ایک رپورٹ میں جو (DUSSELDARFEV · RULES) کہلاتی ہے کہا گیا ہے۔ نوجوانوں کو کرپٹ کرو۔ انہیں مذہب سے دور لے جاؤ، انہیں جنسی لذتوں میں غرق کر دو، انہیں نکما اور نفع پرست بنا دو، ان کی قوتِ ارادی کو توڑ دو، پبلسٹی کے سارے ذرائع پر قبضہ کر لو اور متنازعہ مسائل پر انہیں ذہنی الجھنوں میں ڈال کر تھکا دو۔ اپنے لیڈروں پر سے ان کا اعتماد ختم کر دو۔ معلوم ہوا کہ یہ رپورٹ دائیں بازو کے ایک انتہاپسند لیڈر جارج اے براٹنگم سے حاصل ہوئی تھی۔

حال ہی میں جنوبی کیلیفورنیا میں اسمبلی کے ضمنی انتخابات میں دائیں بازو کی انتہاپسند جماعت (JOHN BRICH-SOEIETY) کے دو ممبروں نے کامیابی حاصل کی یہ نشستیں ریپبلکن پارٹی کے دو ارکان کی موت کے بعد خالی ہوئی تھیں دائیں بازو کے ان دو انتہاپسندوں کی کامیابی جارج ویلاس کی الاباما کی گورنری کے الیکشن میں کامیابی کے رجحان کے فروغ کی نشاندہی کرتی ہے۔ جارج ویلاس نسل پرستی کے کٹر حامیوں میں شمار ہوتے ہیں موصوف نے امریکی اسکولوں میں نیگروز کے داخلے کے خلاف سخت رویہ اختیار کیا تھا۔ ۱۹۶۸ء کے صدارتی انتخابات میں جارج ویلاس نے آزاد امیدوار کی حیثیت سے حصہ لیا تھا۔ اور ایک کروڑ سے زیادہ ووٹ حاصل کئے تھے۔ جارج ویلاس کا الاباما کے گورنر کی حیثیت سے انتخاب اس بات کی علامت ہے کہ ۱۹۷۲ء کے صدارتی انتخابات میں جارج ویلاس صدر نکسن کے ایک بڑے حریف ثابت ہوں گے۔ جارج ویلاس جیسے انتہا پسند نسل پرستوں کی مقبولیت میں اضافہ اس بات کا ثبوت ہے کہ امریکہ میں انتہاپسندوں کی سرگرمیاں تیزی سے پھیل رہی ہیں۔

اور یہ بات آخر کار امریکی قوم کی تباہی کا باعث بن جائے گی کمبوڈیا میں امریکہ کی غیر متوقع مداخلت، بے روزگاری میں اضافہ جرائم کی بہتات، قانون شکنی کا بڑھتا ہوا رجحان اور امریکی معیشت میں بڑھتا ہوا عدم استحکام، ۱۹۷۲ء میں صدر نکسن کی ریپبلکن پارٹی کے لئے ایک بڑا چیلنج ہوگا۔ ان حالات میں اس بات کا امکان ہے کہ دائیں بازو کے انتہاپسند اور نسلی منافرت کے علمبردار اور زیادہ فائدہ اٹھائیں گے۔

دوسری طرف حکومت نے امریکہ میں محکمۂ جاسوسی کے ادارے ایف بی آئی کے علاوہ مقامی پولیس کو بھی وسیع اختیارات دے دئے گئے ہیں۔ آج کل پولیس کی مختلف ایجنسیاں ایسے لوگوں کی خفیہ فائلیں تیار کر رہی ہیں جن پر امریکہ دشمنی کا شک ہے پولیس بے جھجک گھروں میں گھس جاتی ہے۔ اور شک کی بنا پر جس شخص کی چاہے تلاشی لیتی ہے۔ حکومت کی پالیسیوں سے اختلاف رکھنے والے وکیلوں، ڈاکٹروں، یہاں تک کے وزراء کے ٹیلیفون ٹیپ کئے جاتے ہیں۔

۳۳ ہزار فون روز چیک ہوتے ہیں

واشنگٹن موہیٹ کی خبر کے مطابق صرف واشنگٹن میں روزانہ ۳۳ ہزار ٹیلیفون ”چیک“ کئے جاتے ہیں۔ ٹیلیفون پر ہونے والی بات چیت کو چیک کرنے کا مقصد یہ بتایا جاتا ہے کہ اس کے ذریعہ ٹیلیفون کی کارکردگی کا اندازہ لگایا جاتا ہے پولیس کی ان دھاندلیوں کے خلاف عوام کی شکایت پر سینیٹر کینیڈی اور دوسرے ارکان نے اس ”زیادتی“ کو ختم کرانے کا وعدہ کیا۔ لیکن اس سلسلے میں اب تک کوئی کارروائی نہ ہو سکی ضلع کولمبیا کے ایک زیرِ بحث بل کے تحت پولیس کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ بعض خاص صورتوں میں بغیر اطلاع دئے دروازے توڑ کر گھروں میں جا سکتی ہے اور کسی بھی ایسے شخص کا ٹیلیفون سن سکتی ہے جس پر حکومت کے خلاف سرگرمیوں کا شبہ ہو۔

ان اطلاعات سے امریکہ میں بڑھتی ہوئی لاقانونیت نسلی منافرت، پولیس کی دہشت گردی جرائم اور بے روزگاری کی نازک صورتِ حال کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ کولمبیا یونیورسٹی کے پروفیسر ادران جیسے بہت سے امریکی ان حالات کے پیش نظر امریکہ کے مستقبل سے مایوس نظر آ رہے ہیں۔



امریکی سامراج کی ڈپلومیسی کے مزار پر

مصری عوام نے ایک نئی تعمیر مکمل کی ہے



یہ اسوان بند ہے

مصطفیٰ

اسوان بند مکمل ہو گیا متحدہ عرب جمہوریہ میں آبپاشی کا یہ عظیم منصوبہ بجا طور پر دنیا کا آٹھواں عجوبہ ہے۔ لیکن اسوان بند کی اہمیت محض متحدہ عرب جمہوریہ تک محدود نہیں۔ یہ ایک عظیم قوم کے جذبۂ غیرت، حمیت اور خود اعتمادی کی علامت ہے۔ امریکہ اور مغربی ممالک نے اب سے بارہ سال قبل جب اسوان بند کی تعمیر کے لئے مالی امداد دینے سے انکار کر دیا۔ اور اس معاملے میں دباؤ ڈال کر متحدہ عرب جمہوریہ کی سیاسی اور اقتصادی حکمت عملی کو اپنی مصلحت کے مطابق موڑنے کی کوشش کی تو سارے مشرق وسطیٰ ایشیا، اور افریقہ کی نگاہیں صدر ناصر پر لگ گئیں کہ اب دیکھئے مصر کا مردِ آہن کیا فیصلہ کرتا ہے، لیکن ناصر نے یہ دباؤ ماننے سے انکار کر دیا اور اسوان بند کی تعمیر کے لئے سوویت روس سے معاہدہ کیا۔ اس طرح اسوان بند، متحدہ عرب جمہوریہ کی تاریخ میں ایک نیا موڑ ثابت ہوا۔ اسوان بند کی تاریخ، ایک قوم کے نئے تعمیری دور کی تاریخ ہے۔ اسی مثال کی روشنی میں عرب دنیا کے دوسرے ملکوں نے بھی سامراج کی دوستانہ گرفت سے آزاد ہونے کی جد و جہد تیز کر دی،

جب اسوان بند کی تعمیر شروع ہوئی

اسوان بند، اپنی عظمت میں اہرام مصر کی طرح بلند نہ سہی لیکن اس نے ایک پوری قوم کو نئی زندگی دی ہے، اس کی عظمت اس کے کثیر المقاصد ہونے میں ہے۔ صحرائے نوبیا کے وسط میں ایستادہ انجینیرنگ کا یہ شاہکار گیارہ سال کی مدت میں مکمل ہوا۔ اسوان بند ۳۶۴ فٹ بلند اور تقریباً ۲½ میل طویل ہے، اس کے ساتھ ہی ایک بجلی گھر تعمیر ہوا ہے۔ جس سے ۲۱ لاکھ کلو واٹ بجلی پیدا ہو گی۔ اس کے لئے کئی ہزار میل لمبی بجلی کی تاریں بچھائی گئی ہیں۔ اس بند کی وجہ سے دریائے نیل کا پانی جھیل نصر میں جمع ہو گا۔ اس جھیل کی لمبائی ۳۰۰ میل ہے۔ اور چوڑائی اوسطاً ۶ میل یہاں سے ملک کی صنعتی اور زرعی ضرورتوں کے لئے سستی بجلی مہیا ہو گی۔ اور ملک میں بڑی صنعتیں لگانے میں مدد ملے گی۔ لہٰذا ایک لاکھ ٹن سالانہ پیداوار ایلومینیم کا پلانٹ اور اس کے علاوہ سپر فاسفیٹ اور فیرو سیلیکن کے پلانٹ لگائے جائیں گے۔ اسی طرح ہلوان آئرن اور سٹیل ورکس میں توسیع ممکن ہو گی۔ جن کے لئے اسوان سے پیدا ہونے والی بجلی کی نصف مقدار درکار ہو گی۔

مرحوم صدر ناصر کی قیادت میں ۱۹۵۲ء کے انقلاب مصر کے بعد انقلابی قیادت نے دیگر ترقیاتی منصوبوں کے علاوہ دریائے نیل کے پانی کو قابو کرنے کی طرف بھی توجہ دی۔ کیونکہ نہ صرف آب پاشی کے مسائل حل طلب تھے بلکہ صنعتی ترقی کے لئے بھی بجلی کی ضرورت تھی۔

اس منصوبے کے لئے سرمایہ حاصل کرنے کی غرض سے جب عالمی ترقیاتی بینک کی طرف رجوع کیا گیا تو اس نے اس منصوبے کے پہلے مرحلے کے لئے سرمایہ فراہم کرنے کا وعدہ کیا لیکن جب نہر سویز کو قومی ملکیت میں لینے کا سوال اُٹھا تو عالمی بینک نے امریکہ کے اشارے پر اسوان بند کی تعمیر کیلئے امداد کے وعدے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ لیکن مصری قیادت نے امریکی دباؤ کی پرواہ کئے بغیر ۲۶ جولائی ۵۶ء کو نہر سویز قومی ملکیت میں لینے کا اعلان کر دیا اس اعلان کے ساتھ ہی برطانیہ فرانس اور اسرائیل نے مصر پر زبردست حملہ کر دیا۔ مگر روس نے اس آڑے وقت میں مصر کی زبردست اخلاقی مدد کی اور یہ جنگ بند ہو گئی۔

جنگ کے بعد مصر نے روس سے اسوان بند کی تعمیر کے لئے گفت و شنید کی۔ یوں بھی روسی ماہرین کو اپنے ہاں دریائے والگا پر ایسے بڑے منصوبے بنانے اور بڑی طاقت والی بجلی کی تاریں بچھانے کا عملی تجربہ بھی تھا۔ اسوان بند کی تعمیر کے پہلے مرحلے کے لئے دسمبر ۱۹۵۸ء میں روس سے معاہدہ عمل میں آیا۔ جنوری ۱۹۶۰ء میں تعمیر کا کام شروع ہو گیا۔ مئی ۱۹۶۴ء میں دریائے نیل کے پانی کا رخ موڑنے کا پہلا اور بہت مشکل مرحلہ کامیابی سے طے ہو گیا۔ ۱۹۶۴ء کے موسم بہار میں عظیم اسوان بند سے مصری عوام نے استفادہ شروع کر دیا۔ ۱۹۶۴ء کے موسم خزاں میں اس بند کی وجہ سے مصر کے زیریں علاقے میں سیلاب سے بچاؤ ممکن ہوا اور ۱۹۶۷ء میں خوفناک خشک سالی کا مقابلہ کرنے میں اس سے بڑی مدد ملی۔

پچھلے چند سالوں سے زیریں اور بالائی مصر کی ۳ لاکھ ۶۵ ہزار ایکڑ زمین کو تمام سال پانی مہیا ہوتا ہے۔ جس سے اس زمین کی سالانہ فصل میں ۵۰ فیصدی اضافہ ہوا ہے۔ اس کے علاوہ ۳ لاکھ ۸۰ ہزار ایکڑ نئی زمین کو قابل کاشت بنایا جا چکا ہے، ۱۹۶۱ء میں چاول کی پیداوار ۲ لاکھ ٹن تھی جو ۱۹۶۹ء میں ۲۲ لاکھ ٹن ہو گئی اس سے ملک کو باہر سے غلہ درآمد کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ ۱۹۶۷ء میں اسوان بجلی گھر سے بجلی بھی فراہم ہونے لگی جو بہت سستی پڑتی ہے۔

زبردست صنعتی اور فنی ترقی

۱۹۷۰ء میں مصر کی قومی آمدنی ۱۳ کروڑ مصری پاؤنڈ تک پہنچ گئی جس میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ امید ہے کہ یہ تعداد بڑھ کر ۲۳ کروڑ مصری پاؤنڈ ہو جائے گی۔ اس منصوبے کے دُوررس سماجی اثرات بھی ہیں۔

جب تعمیر کے عروج کا زمانہ تھا تو یہاں چالیس ہزار مصری محنت کش کام کرتے رہے۔ یہ لوگ اب تربیت حاصل کر کے ماہر ہو چکے ہیں۔ ان میں پندرہ ہزار ڈرائیور، الیکٹریشن اور فٹر، شامل ہیں۔ تعمیر کے دوران میں تربیت حاصل کرنے کے علاوہ کئی افراد نے روس جا کر ٹریننگ حاصل کی۔ اس طرح روس کی امداد سے اسوان ٹریننگ سنٹر قائم ہوا جہاں سے پندرہ سو افراد ہر سال تربیت حاصل کرتے ہیں۔

مغربی سامراجیوں کی ریشہ دوانیوں اور اسرائیل کی جارحیت کے باوجود مصر کے لوگوں نے بڑے پیمانے پر اس منصوبے میں عملی دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ دنیا کے اتنے بڑے منصوبے کی تکمیل اس بات کا عملی ثبوت ہے کہ نہ صرف مصر کے لوگ بلکہ تمام آزاد ممالک کے عوام اپنی خفیہ صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ترقی اور خوشحالی کی راہ پر گامزن ہو سکتے ہیں۔

قومی آزادی کی حفاظت اس وقت نہیں ہو سکتی جب تک ملک کی معیشت مضبوط بنیادوں پر قائم نہ ہو۔ کیونکہ معاشی آزادی کے بغیر سیاسی آزادی بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔

اسوان بند کی تکمیل سے نہ صرف متحدہ عرب جمہوریہ کے عوام کا مستقبل روشن ہو گا بلکہ ان میں ملک کے باہر کے دشمن کے خلاف لڑنے اور ہر طرح کے خطرات کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کی صلاحیت بڑھے گی۔

دریچے

م۔ اسلم ملک

سانپ اور بچھو ایک سوراخ میں جمع ہو جائیں گے لیکن علماء دنیا پرست کبھی ایک جا اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ کتوں کا مجمع دیسے تو خاموش رہتا ہے لیکن ادھر قصائی نے ہڈی پھینکی اور ادھر ان کے پنجے تیز اور دانت زہر آلود ہو گئے۔ یہی حال ان سگانِ دنیا کا ہے۔ ساری باتوں میں متفق ہو سکتے ہیں لیکن دنیا کی ہڈی جہاں سامنے آئی ہو وہاں پہنچ کر اپنے پنجوں اور دانتوں پر قابو نہیں رکھ سکتے۔ ان کا سرمایۂ ناز علم حق نہیں ہے جو تفرقہ مٹاتا اور اتباع سبھی متفرقہ کی ایک ہی صراطِ مستقیم پر چلاتا ہے بلکہ یکسر علم جدل و خلاف ہے۔ نفس پرستی اس کی کثافت کو خمیر دیتی ہے اور دنیا طلبی کی آگ اس کی ناپاکی کے بخارات کو اور زیادہ تیز تر کرتی رہتی ہے۔ فساق و فجار خرابات میں بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کا جامِ صحت پیتے ہیں۔ اور چور اور ڈاکو مل جل کر رہزنی کرتے ہیں مگر یہ گروہ خدا کی مسجد اور زہد و عبادت کے صومعہ و خانقاہ میں بیٹھ کر بھی متحد و یک دل نہیں ہو سکتا۔ اور ہمیشہ ایک دوسرے کو درندوں کی چیرتا پھاڑتا اور پنجہ مارتا رہتا ہے۔ میکدوں میں محبت کے ترانے اور پیار و الفت کی باتیں سننے میں آ جاتی ہیں، مگر ہمیں محرابِ مسجد کے نیچے پیشوائی و امارت کے لئے ان میں سے ہر ہاتھ دوسرے کی گردن پر بڑھتا اور خونخواری کی ہر آنکھ دوسرے بھائی کے خون پر لگی ہوتی ہے حضرت مسیح علیہ السلام نے احبارِ یہود سے فرمایا تھا "تم نے داؤد کے گھر کو ڈاکوؤں کا بھٹ بنا دیا ہے": ڈاکوؤں کے بھٹ کا حال تو نہیں معلوم لیکن ہم نے مسجدوں کے صحن میں بھیڑیوں کو ایک دوسرے پر غراتے اور خون آشام دانت مارتے دیکھتے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ افکارِ آزاد

یوں تو ذہنی طور سے مجنوں اور جرائم پیشہ لوگوں کے علاوہ سبھی مانتے ہیں کہ امن اور آزادی بہت حسین اور تابناک چیزیں ہیں اور یہ سبھی تصور کر سکتے ہیں کہ امن گندم کے کھیت ہیں اور سفیدے کے درخت، دلہن کا آنچل ہے اور بچوں کے ہنستے ہوئے ہاتھ، شاعر کا قلم ہے اور مصور کا موئے قلم اور آزادی ان سب صفات کی ضامن اور غلامی ان سب خوبیوں کی قاتل ہے جو انسان اور حیوان میں تمیز کرتی ہیں۔ یعنی شعور و ذہانت، انصاف اور صداقت، وقار اور شجاعت، نیکی اور رواداری۔ اس لئے بظاہر امن اور آزادی کے حصول اور تکمیل کے متعلق ہوشمند انسانوں میں اختلاف کی گنجائش نہ ہونا چاہیئے۔ لیکن بد قسمتی سے یوں نہیں ہے۔ اس لئے نہیں ہے کہ انسانیت کی ابتدا سے اب تک ہر عہد اور ہر دور میں دو متضاد عوامل قوتیں برسرِ عمل اور برسرِ پیکار رہے ہیں، یہ قوتیں ہیں، تخریب و تعمیر، ترقی و زوال، روشنی اور تیرگی انصاف دوستی اور انصاف دشمنی کی قوتیں۔ یہی صورت آج بھی ہے اور اسی نوعیت کی کشمکش آج بھی جاری ہے۔

(فیض احمد فیض۔ ماسکو میں لینن پرائز وصول کرتے ہوئے)

میں اس لئے انتہا پسند ہوں کہ جو شخص
اظہارِ صداقت میں
اعتدال کرتا ہے
وہ صرف نصف صداقت کا اظہار کرتا ہے
اور اس کا باقی نصف حصہ
لوگوں کے خوف کی وجہ سے پوشیدہ رکھتا ہے

(خلیل جبران)

سنگ و خشت

ظہیر اختر بیدری

- اردو کے تحفظ کی تحریک طاقت اور تشدد سے نہیں کچلی جا سکتی۔ (ایک خبر)

اردو کا تحفظ بھی تشدد اور جبر سے نہیں کیا جا سکتا۔

- کراچی میں فولاد کے کارخانے کی تعمیر عنقریب شروع ہو جائے گی۔ (ایس ایم یوسف)

ذرا اس 'عنقریب' کی وضاحت کر دیجئے۔ کیونکہ ۲۰ سال سے اس عنقریب کا سلسلہ جاری ہے۔

- انقرہ میں پولیس نے ترک طلبا کے ساتھ پاکستانی طلبا پر بھی آنسو گیس کے گولے برسائے (ایک خبر)

آر سی ڈی میں مساوی حصے کی ایک مثال

- متمول افراد صحت عامہ کے مسئلہ پر خصوصی توجہ دیں۔ (صدر یحییٰ خاں)

ایسے مشوروں سے متمول افراد کی صحت خراب ہو جائے گی۔

- آئین میں قانونی ڈھانچے کو نظر انداز کیا گیا تو تحریک چلائی جائے گی۔ (احتشام الحق)

منہ چلانے والے تحریک نہیں چلا سکتے۔ مولانا!

- چھ نکات سے پنجاب کو فائدہ پہنچے گا۔ (سردار شوکت حیات)

کاش یہ بات آپ الیکشن سے پہلے فرماتے۔!

- نکسل باڑیوں کا جیل پر حملہ۔ قیدیوں کو رہا کرا لیا گیا (ایک خبر)

پاکستان میں ایسی خطرناک خبروں کا داخلہ بند کیا جائے۔

- مجیب الرحمٰن وزیر اعظم نہیں بنیں گے۔ (ایک خبر)

خدا جب حسن دیتا ہے، نزاکت آ ہی جاتی ہے۔

- امریکہ کی مدد سے جنوبی ویت نام کی فوجوں نے لاؤس پر زبردست حملہ کر دیا۔ (ایک خبر)

امن قائم کرنے کا امریکی طریقہ جو خواص میں بہت مقبول ہو رہا ہے۔

- پاکستانی طوائفیں عصمت فروشی کے لئے دوبئی پہنچ گئیں۔ (ایک خبر)

کیا فرماتے ہیں مفتیانِ فروشش بیچ اس مسئلہ کے۔

- نشاط ٹیکسٹائل ملز کے مالکان مل کے حصے بخرے کر رہے ہیں۔ (ایک خبر)

مزدوروں کے لئے تین چوتھائی حصہ چھوڑ دیں۔ باقی بھلے کر لیں۔

- لائل پور میں ایک سو مزارعین کو بے دخل کر دیا گیا۔ ان کے مکان گرا دئے گئے۔ (ایک خبر)

معلوم ہوتا ہے "جمہوریت" کے استقبال کی تیاریاں زوروں پر ہیں۔

- آر سی ڈی کے "بنیادی مقاصد" ابھی پورے نہیں ہو سکتے۔ (اردشیر زاہدی)

پاکستان میں سیاسی موسم بڑا ناسازگار ہے۔

- جیب تراش نے مجسٹریٹ کی جیب صاف کر دی۔ (ایک خبر)

اللہ اور دے گا۔

- آر سی ڈی کو سینٹو میں تبدیل نہیں کیا جائے گا۔ (احسان صابری)

ایڈیٹر کا مراسلہ نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

حسن اکبر کمالؔ

یوں نہ تھا میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے

اپنی اپنی زبانوں کے حامی
سڑک پر نکل آئے ہیں
اُن کے طیش و غضب کا یہ عالم ہے جیسے
زباں اُن کی ماں ہو، وہ جس کے لئے
جان دے دیں گے اور کٹ مریں گے

(نفرتوں سے دہکتی ہوئی اُن کی پیشانیوں پر جو تحریر ہے
سندھ کے باسیو! کیا یہ تم سب کی تقدیر ہے؟)

اپنی ماؤں کی حُرمت کے یہ سب محافظ اگر
دوسرے شخص کی ماں کی توقیر و تکریم بھی کر سکیں
سچلؔ و شاہؔ کی سرزمیں
پیار کے نور سے جگمگانے لگے
امن کے گیت پھر گنگنانے لگے!

○

غزل

طالب حسین اشرف

شمشیرِ مصلحت سے کچھ اس طرح کٹ گیا
صحرا تھا میرا جسم کہ ذرّوں میں بٹ گیا

جب بھی ہوا خیال کہ اظہارِ فن کروں
آئینہ دل کا گردِ تفکّر سے اٹ گیا

اس رمزِ زندگی سے نہیں کوئی آشنا
دریائے درد کوزۂ جاں میں سمٹ گیا

موت و حیات میں تھے کئی فاصلے مگر
صدیوں کا کام ایک ہی پل میں نمٹ گیا

پیکارِ خیر و شر میں عجب معرکہ ہوا
تیرے لئے میں اپنے مقابل ہی ڈٹ گیا

کوئی مجھے بتائے کہ وہ شخص کون تھا
جو دل میں اِک چراغ جلا کر پلٹ گیا

○

یہ رپورٹ بعض اساتذہ کی فراہم کردہ اطلاعات کی روشنی میں مرتب کی گئی ہے

"ہم ڈاکٹر قریشی سے استعفےٰ کا مطالبہ کیوں کرتے ہیں؟" جامعہ میں

کراچی یونیورسٹی ٹیچرز سوسائٹی نے حال ہی میں ایک قرارداد کے ذریعے جامعہ کے وائس چانسلر ڈاکٹر اشتیاق حسین سے مستعفی ہونے کا مطالبہ کیا ہے۔ زیرِ نظر مضمون میں ڈاکٹر قریشی کی صرف اُن کارگزاریوں کی تفصیل پیش کی گئی ہے جو انھوں نے اساتذہ کے ساتھ گزشتہ دس سال میں روا رکھی ہیں۔ ان کے مطالعے سے اساتذہ کے مطالبے کی اہمیت اور صداقت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ جامعہ کے وائس چانسلر حسبِ سابق اِن الزامات کا بھی کوئی جواب نہیں دیں گے، لیکن اربابِ دانش کو کم از کم یہ تو معلوم ہو ہی جائیگا کہ انکے شہر کی اعلیٰ ترین درسگاہ کے سربراہ کس درجہ کے بزرگ ہیں۔

کراچی یونیورسٹی ٹیچرز سوسائٹی نے ۴ جنوری کو ایک عام اجلاس میں وائس چانسلر ڈاکٹر قریشی کے خلاف عدمِ اعتماد اور مذمت کی قرارداد منظور کرتے ہوئے ان سے یہ مطالبہ کیا کہ پندرہ دن کے اندر اندر مع اپنی حاشیہ بردار سنڈیکیٹ کے مستعفی ہو جائیں۔ اس سے پیشتر بھی انجمن اساتذہ نے حکومت سے مطالبہ کیا تھا کہ یونیورسٹی کے حالات کی تفتیش کے لئے ایک انکوائری کمیٹی مقرر کی جائے۔ لیکن آج تک اس مطالبہ پر حکومت کی طرف سے کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ کراچی کے اخبارات میں بھی مدّتوں سے یونیورسٹی میں ہونے والی دھاندلیوں کی تفصیل آتی رہی لیکن نہ تو وائس چانسلر صاحب نے اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ ان الزامات کا جواب دیتے، نہ حکومت نے اِن مسائل میں تحقیقات کرنے کی ضرورت سمجھی۔ آخر نوبت یہ آپہنچی کہ اساتذہ گفت و شنید سے مایوس ہو کر استعفیٰ طلب کرنے پر اُتر آئے۔

ڈاکٹر قریشی کے اس دس سالہ دورِ استبداد کا اب خاتمہ ہونا ہی چاہیئے۔ جبکہ پورے ملک میں آزادی اور جمہوریت کی فضا بحال ہو گئی، یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ ہمارے تعلیمی ادارے جو قوم کے جاگتے ہوئے ضمیر اور سوچنے والے ذہن کی حیثیت رکھتے ہیں، اب تک کالے قوانین اور آمروں کے غلام ہیں۔ ۶۱ء میں کراچی کے طلبا نے ایوب آمریت کو سب سے پہلے چیلنج کیا جس کی پاداش میں انہیں پولیس کے مظالم اور جیل میں قید بامشقت کی اذیتیں اٹھانا پڑیں۔ اس کے فوراً بعد ہی ایوب خاں نے ڈاکٹر قریشی کو اس یونیورسٹی کے سیاہ و سفید کا مالک بنا کر بٹھایا نتیجہ یہ نکلا کہ ۶۸ء میں جب پورے ملک میں بحالیٔ جمہوریت کی تحریک چلی تو کراچی یونیورسٹی یونین کے عہدیداروں نے اس کی باقاعدہ مخالفت کی۔ اور ۶۹ء کے جلسۂ تقسیم اسناد میں ڈاکٹر قریشی نے اس عوامی تحریک کو جس پر ہم ناز کرتے ہیں فتنہ و فساد قرار دیا۔

ڈاکٹر قریشی نے یونیورسٹی کے تعلیمی ماحول کو مسخ کرنے اور اس میں گھٹن پیدا کرنے کے لئے دھونس دھاندلی، بے ایمانی، سازش، مکر و فریب غرض ہر حیلہ استعمال کیا۔ اور اسلام کا مُقدس نام لے لے کر ہر انصاف طلب کرنے والی آواز کا گلا گھونٹ دیا۔ ایک مرتبہ پھر ہم ڈاکٹر قریشی صاحب کی خدمت میں چند سوالات پیش کرنا چاہتے ہیں جو ان پالیسیوں سے متعلق ہیں جو انہوں نے اساتذہ کے سلسلے میں اختیار کیں۔ یہاں شائستہ زیدی صاحبہ، اور ڈاکٹر اطہر رشید کا ذکر فی الحال ہم نہیں کرتے۔ اس لئے کہ اِن واقعات پر تو سارے اخبارات آپ سے وضاحت طلب کرتے کرتے تھک گئے لیکن آپ کی خاموشی نہ ٹوٹی۔ اب کچھ اور واقعات ہیں ان ہی کی وضاحت کر دیجئے۔

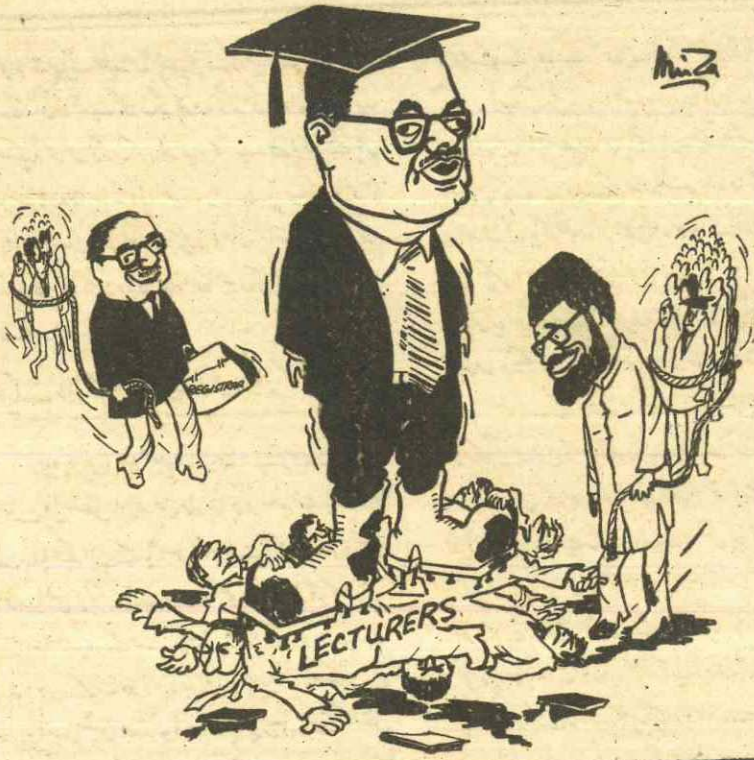
۱۔ کیا یہ صحیح نہیں کہ اساتذہ کے تقرر، ترقی، برطرفی سب امور میں، اساتذہ کے آپ سے، اور چند متقدر ہستیوں مثلاً رجسٹرار میجر آفتاب صاحب وغیرہ سے ذاتی تعلقات، سب سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ اور علمی قابلیت اور تدریسی صلاحیت سب سے غیر اہم۔ سنا ہے اسی لئے جامعہ کراچی میں ایڈ ہاک بنیاد پر تقرر کا سلسلہ بہت عام ہے۔ حالانکہ چھ ماہ کے لئے کسی کو عارضی طور پر ملازم رکھنے کا اختیار شیخ الجامعہ کو محض اس لئے حاصل ہوتا ہے کہ اگر کوئی ہنگامی صورتِ حال پیدا ہو جائے مثلاً کوئی اُستاد سال کے درمیان میں ملازمت چھوڑ کر چلا جائے تو فوری طور پر کسی کا تقرر ہو سکے تاکہ تدریس کا نقصان نہ ہو۔ لیکن پھر جلد از جلد مستقل انتظام کیا جائے۔ لیکن آپ کے یہاں تقریباً ہر تقرر اسی ہنگامی صورتِ حال میں ہوتا ہے۔ اگر آپ بہتر اُستاد کے تقرر میں دلچسپی رکھتے ہوں تو قاعدے سے اخبارات میں آسامیاں مشتہر ہونی چاہئیں۔ اور پھر جتنے لوگ بھی درخواست دیں اُن میں سے آپ بغیر کسی تعصّب کے بہترین اُمیدوار منتخب کر لیں۔

لیکن آپ آسامیاں مشتہر کرنے سے پہلے کسی کو ایڈ ہاک بنیاد پر ملازم رکھ چکے ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ آسامیوں کو کسی بہتر اُمیدوار کی تلاش کے لئے نہیں بلکہ اِس لئے مشتہر کیا جاتا ہے کہ کسی منتخب شدہ عارضی ملازم کو مستقل کرنا ہوتا ہے۔ آسامیاں بھی شعبے کی ضرورت کے مطابق پیدا نہیں کی جاتیں، بلکہ جب کسی کو ملازم رکھنا ہوتا ہے تو اس کے لئے جگہ بن جاتی ہے جب کسی کو نہیں رکھنا ہوتا تو بہانہ یہ ہوتا ہے کہ جگہ ہی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ذاتی تعلقات کی بناء پر بیشمار نااہل لوگ اسٹاف میں داخل ہو چکے ہیں اور ترقیاں پاتے رہتے ہیں، جبکہ بعض لائق اساتذہ کے لئے یونیورسٹی کے دروازے ہمیشہ بند رہتے ہیں۔ ثبوت کے طور پر ہم چند واقعات پیش کرتے ہیں۔

دو سال پہلے کچھ تقرر اور ترقیاں ہوئیں۔ شیخ رشید شعبہ کیمیا میں اور جاوید قمر صاحب شعبہ ریاضی میں مددگار لیکچرر مقرر کئے گئے۔ شیخ رشید صاحب کیمیا میں محض سیکنڈ کلاس M. Sc. ہیں۔ اور جاوید قمر صاحب نے کئی سال فیل ہو کر قسطوں میں M. Sc. کا امتحان پاس کیا ہے اور وہ بھی محض سیکنڈ ڈویژن میں ان دونوں شعبوں سے کامیاب ہونے والے طلباء میں ہر سال بیشمار طالب علم

شعبہ ریاضی کے اسلام پسند اُستاد اسلام الدین صاحب کو آپ نے شماریات کے ایک وظیفے پر باہر بھیجا، حالانکہ آپ کے یہاں شماریات کے کئی اُستاد اس وظیفے کے متمنی تھے۔ اسلام الدین صاحب شاید ان مظلوموں کی بددعاؤں سے تین سال باہر رہے اور کوئی ڈگری نہ لے سکے۔ واپسی پر آپ نے ان کی ناکامی کے باوجود انھیں تین سالانہ ترقیاں عنایت کیں۔

دس سالہ دورِ آمریت کا جائزہ



وائس چانسلر، اساتذہ پر اس طرح حکومت کرتے ہیں۔ (بشکریہ ڈیلی نیوز)

فرسٹ ڈویژن میں امتحان پاس کر کے نکلتے ہیں۔ کیوں ڈاکٹر قریشی صاحب! کیا ان بدقسمت فرسٹ ڈویژن حاصل کرنے والوں میں ایک فرد بھی یونیورسٹی میں استاد بننے کے لائق نہ تھا، اور اس زمانے میں جب بہتر سے بہتر نمبر میں ڈگری لینے والوں کو روزگار نہیں ملتا، آپ کی نظرِ انتخاب ان ہی دونوں پر پڑی؟ جبکہ ہمارے پاس یہ اطلاع پہنچ چکی ہے کہ آپ کی عنایت کے باوجود شیخ رشید کے ساتھ کچھ فرسٹ ڈویژن پانے والے حضرات نے قسمت آزمائی بھی کی۔ اور آپ کا فیصلہ بدلوانے کی کوشش بھی کی۔ لیکن نہ صرف یہ کہ آپ نے شیخ رشید کو ہی ترجیح دی اور استاد مقرر کیا بلکہ انہیں ایک ہاسٹل کا وارڈن بھی بنایا تاکہ وہ جاسوسی کے فرائض زیادہ خوش اسلوبی سے انجام دے سکیں۔

اسی زمانے میں شعبۂ کیمیا میں ڈاکٹر محبوب الٰہی ہمدرد اور ڈاکٹر ظفر نعیم کو ترقی دے کر ریڈر بنایا گیا۔ اور ان کے ساتھ دو اُمیدواروں یعنی مولانا شمیم احمد صاحب اور ڈاکٹر حمزہ انصاری کو ترقی نہیں دی گئی۔ مولانا شمیم احمد اس شعبہ کے بانی ممبروں میں سے ہیں۔ جو لوگ جامعہ میں بحیثیت ڈیمانسٹریٹر بھرتی ہوئے تھے وہ اب پروفیسر ہو چکے ہیں۔ مولانا شمیم احمد ۱۹۵۳ء میں بھی لیکچرر تھے اور اب بھی لیکچرر ہیں۔ مدتوں سے لیکچررشپ کی آخری حد پر پہنچ چکے ہیں اور جہاں تک قابلیت کا تعلق ہے تو یونیورسٹی میں ایسے قابل اساتذہ کی تعداد شاید اُنگلیوں پر ہی گنی جا سکے۔ کراچی یونیورسٹی تو کیا شمیم صاحب ۱۹۴۶ء میں علیگڈھ یونیورسٹی کے نہایت قابل اساتذہ میں شمار ہوتے تھے۔ وہ متعدد گراں قدر تحقیقاتی مقالے بھی شائع کرا چکے ہیں۔ اس کے برعکس ڈاکٹر ہمدرد نے کوئی تحقیقاتی مقالہ شائع نہیں کرایا۔ حالانکہ وہ ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی کے تحقیقاتی ادارے سے منسلک ہیں۔ اور اس بُنیاد پر کوئی کلاس بھی نہیں پڑھاتے سُنا ہے ڈاکٹر ظفر نعیم اس سے پیشتر بھی ایک بار ریڈرشپ کے لئے انٹرویو میں پیش ہو کر مسترد ہو چکے تھے۔ کیا ہم پوچھ سکتے ہیں کہ اس زمانے میں انہوں نے اپنی قابلیت میں کیا اضافہ کیا جو ایکبے ریڈر بنا دیے گئے۔ حالانکہ ہماری اطلاع ہے کہ اس دوران میں نہ انہوں نے کوئی نئی ڈگری لی نہ کوئی تحقیقاتی مقالہ شائع کرایا۔ ہاں البتہ ان کے صدرِ شعبہ نے دو تین دفعہ اُنکی شکایت ضرور کی جس پر ان سے استفسار بھی کیا گیا۔ لیکن صدرِ شعبہ کی تمام شکایتوں کے باوجود انہیں کچھ نامعلوم "کارناموں" کی بناء پر ترقی دے دی گئی۔ اس کے برعکس آپ نے ریاضی کے صدرِ شعبہ کی شکایت پر تو شائستہ زیدی کو برطرف کر دیا تھا اور یہ عذر بھی پیش کیا تھا کہ میں مجبور ہوں اُن کے صدرِ شعبہ کی رپورٹ ان کے خلاف ہے۔

ان ہی صدرِ شعبہ کی رپورٹ پر آپ نے ڈاکٹر زیدی کی سالانہ ترقیاں تین سال سے روک دی ہیں۔ کیا آپ بتائیں گے کہ یونیورسٹی کا قانون اس سلسلے میں کیا کہتا ہے اور صدرِ شعبہ کے اختیارات کا کس طرح تعین کرتا ہے۔ آپ ہمارے اس سوال پر ہنستے ہوں گے کہ ہم بھی کتنی نادانی کی باتیں کرتے ہیں بھلا یونیورسٹی کا قانون سے تعلق۔ یہاں تو جسے پیا چاہے وہی سہاگن کہلائے۔ اور ایک شعبۂ کیمیا کے صدر پر ہی محدود نہیں، ڈاکٹر کیانی نے اجمل صاحب کی شکایت کی تھی۔ طلباء نے ان سے پڑھنے سے انکار کر دیا تھا۔ پھر بھی آپ نے انہیں وظیفہ دے کر باہر بھیجا۔

تھرڈ ڈویژن قبول ہے، اگر وہ اُستاد ہے

۱۹۶۴ء میں جب شعبۂ ریاضی میں لیکچرروں کا تقرر ہوا تو اُن میں خورشید عالم خاں، حسن الدین احمد اور شائستہ زیدی شامل تھیں۔ خورشید صاحب کے تعلیمی ریکارڈ میں دو تھرڈ ڈویژن تھیں۔ بی اے آنرز جیسی اہم ڈگری بھی موصوف نے تھرڈ ڈویژن میں لی تھی اور کینیڈا سے M.Sc کیا تھا۔ حسن الدین صاحب نے بھی ایک سال فیل ہو کر بی ایس سی (آنرز) تھرڈ ڈویژن میں پاس کیا تھا M.Sc سیکنڈ کلاس اور امریکہ سے M.Sc کی ڈگری لی تھی۔ شائستہ زیدی کا پورا تعلیمی ریکارڈ فرسٹ کلاس تھا اور ایڈنبرا سے اعزازی سرٹیفکیٹ کے ساتھ آنرز کی ڈگری لی تھی۔ اس کے علاوہ ایڈنبرا یونیورسٹی میں دو سال تدریسی کام بھی کیا لیکن ان تینوں میں سب سے جونیئر شائستہ زیدی ہی رہیں۔ خورشید صاحب کو ان سے دو ترقیاں زیادہ دی گئیں۔ دلچسپ بات ہے طلباء تھرڈ ڈویژن میں پاس ہوں تو آپ انہیں داخلہ تک سے محروم کر دیں، لیکن اساتذہ تھرڈ ڈویژن کے ہوں تو آپ خوش ہو کر انہیں ترقیاں دیں۔ کچھ عرصے بعد خورشید صاحب دوبارہ پی ایچ ڈی کرنے ایک انجینئرنگ کے طالب علم کے وظیفے پر باہر بھیجے گئے۔ ان کی خاطر ڈاکٹر محمد احمد خان جو دو تین سال سے لیکچررشپ کی آخری حد پر تھے ترقی سے رُکے رہے خورشید صاحب کے واپس آتے ہی انہیں ریڈر بنا یا گیا۔ اس طفیل میں محمد احمد صاحب بھی ریڈر بن گئے۔ لیکن خورشید صاحب کی تنخواہ بھی محمد احمد صاحب کے برابر کر دی گئی۔ جنہوں نے ہر امتحان فرسٹ کلاس میں پاس کیا ہے اور خورشید صاحب سے کہیں زیادہ تدریسی تجربہ رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر قریشی صاحب! کیا اسی طرح آپ باصلاحیت افراد کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں؟

شعبۂ طبیعات سے ۱۹۶۷ء میں نیر صاحب اور احمد علی صاحب کو وجہ بتائے بغیر برطرف کر دیا گیا۔ حالانکہ یہ دونوں فرسٹ کلاس طالب علم رہ چکے تھے۔ اور اُن کے طلباء بھی انکی کارکردگی سے بہت خوش تھے۔ لیکن سُنا ہے انہوں نے انتظامیہ

کی کسی بات پر ایک جلسے میں تنقید کرنے کی جسارت کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی علمیت بھی ان کی کچھ مدد نہ کر سکی اور ان کی جگہ آپ نے سیکنڈ کلاس لوگوں کو رکھ لیا۔ ہم آپ سے پوچھ سکتے ہیں کہ جامعہ کا مفاد اساتذہ کی علمیت میں ہے یا آپ کی چاپلوسی میں۔ جامعہ آپ کی ذاتی جاگیر تو نہیں، قوم کی امانت ہے اور قوم نے آپ کو یہ حق نہیں دیا کہ اپنے مصاحبوں کو اس کے ذریعے نوازتے رہیں۔

ایک ملازم سرکار پر خاص نوازش

۶۴ء میں آپ نے فصیح الدین صاحب کو جو وزارت زراعت میں مستقل ملازم ہیں عارضیتاً بلا کر شعبۂ شماریات کا صدر بنایا جبکہ ان کے پاس شماریات کی کوئی ڈگری نہیں، محض ریاضی کی ڈگری ہے اور وہ بھی سیکنڈ کلاس ہیں۔ فصیح صاحب کے صدر بننے کے بعد دوسرے اُستادوں کے ساتھ زبردست رن پڑا۔ اس کے بعد پروفیسر عتیق اللہ کو ڈھاکہ یونیورسٹی سے مستقل طور پر صدر شعبہ بنا کر بلایا گیا۔ ۶۹ء میں طلباء نے فصیح صاحب سے پڑھنے سے انکار کر دیا۔ لیکن آپ انہیں انکی ملازمت پر واپس بھیجنے کو تیار نہ ہوئے۔ غرض چھ ماہ وہ گھر بیٹھے کی تنخواہ وصول کرتے رہے اور پھر شعبۂ ریاضی کے سر تھوپ دیئے گئے۔ اب وہ سب سے سینئر ریڈر شمار ہوتے ہیں۔ صدر شعبہ کی غیر موجودگی میں صدر شعبہ بنتے ہیں۔ صورت حال یہ ہے کہ وہ محض فرسٹ ایئر آنرز کو پڑھاتے ہیں اور تیرہ سو روپے تنخواہ پاتے ہیں۔ سُنا ہے شعبۂ ریاضی میں ایک درجن سے زیادہ اُستاد باہر کے سند یافتہ ہیں اور یوں بھی یہ خاصا بڑا شعبہ ہے۔ کیا فرسٹ ایئر کو پڑھانے کی اہلیت ان میں سے کوئی نہیں رکھتا۔ ڈاکٹر صاحب! ہماری آپ سے یہ دردمندانہ اپیل ہے کہ فصیح صاحب ایک باقاعدہ سرکاری ملازم ہیں اگر آپ انہیں اپنے یہاں نہیں رکھیں گے تو وہ بیروزگار ہرگز نہ ہوں گے (اور آپ لوگوں کو بیروزگار کرنے سے ڈرتے ہی کب ہیں) انہیں وزارتِ زراعت جانے دیا ہوتا۔ یہ اس کنگال قوم کا پیسہ ہے جس کی اکثریت پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھاتی۔ خدارا اس پیسے کو اس طرح ضائع نہ کریں۔ اس خدا کو اور اس روز قیامت کو کبھی تو یاد کیجیے، جس کا آپ دورانِ گفتگو میں بار بار ذکر کرتے ہیں۔

سُنا ہے ایک اور اُستاد شعبۂ حیاتیات کے ہیں جن کے تعلیمی ریکارڈ میں تھرڈ ڈویژن کی ناگوار حد تک بہتات ہے۔ وہ بھی کوئی کلاس پڑھانے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ ہم ان کا نام فی الحال اس لئے نہیں لیتے کہ وہ بہت سینئر اُستاد ہیں۔ ویسے آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے۔ کاش آپ انہیں سمجھاتے کہ یونیورسٹی اُستاد کا بنیادی کام طلباء کو پڑھانا ہے۔ امریکی وضع کے سجے سجائے آفس میں بیٹھ کر افسری کرنا نہیں۔

آپ کے رجسٹرار صاحب نہ صرف انگریزی بلکہ اردو کے املا تک میں اکثر غلطیاں کر بیٹھتے ہیں۔ ایک مرتبہ اُنہوں نے یہ اعلان کرنے کے بجائے کہ جلسہ تقسیم اسناد شروع ہو رہا ہے یہ اعلان کر دیا کہ جلسہ ختم ہو چکا۔ موصوف ادیب شاعر بھی ہیں، لیکن اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں، کیونکہ یہ تحریریں ایوب خاں کی قصیدہ خوانی میں لکھی گئی تھیں۔ موصوف حلیم صاحب کے زمانے میں آفس سپرنٹنڈنٹ سے ترقی کرتے کرتے شعبۂ امتحانات کے انچارج ہو گئے۔ اسی زمانے میں جسٹس انعام اللہ کی سرکردگی میں یونیورسٹی کے حالات پر ایک تحقیقاتی کمیشن بٹھلایا گیا۔ جس کے بعد یہ صاحب شعبۂ امتحانات سے ہٹا کر ڈپٹی رجسٹرار بنا دیئے گئے۔ دوسرے وائس چانسلر ہاشمی صاحب کے چار سالہ دَور میں یہ اسی عہدہ پر رہے۔ البتہ آپ کے وائس چانسلر مقرر ہوتے ہی ان کی قسمت نے پلٹا کھایا۔ اس وقت ان کی تنخواہ چھ سو یا سات سو روپیہ تھی۔ آپ نے فوراً ان کیلئے ایک نیا عہدہ جوائنٹ رجسٹرار کا پیدا کیا۔ جو اس سے پہلے کبھی نہ تھا۔ کچھ دن بعد انہیں ترقی دینے کے لئے ایک اور نیا عہدہ اسٹیبلشمنٹ آفیسر کا بنایا گیا۔ اور بالآخر ۶۴ء میں ان تمام سیڑھیوں کو پھلانگتے ہوئے یہ رجسٹرار ہو گئے۔ یہ جس جس عہدے سے گزرتے گئے وہ عہدے ان کے ساتھ ہی ختم ہوتے گئے۔ اب یونیورسٹی میں نہ کوئی جوائنٹ رجسٹرار ہے اور نہ اسٹیبلشمنٹ آفیسر اور نہ ڈپٹی رجسٹرار۔ شاید ان اسامیوں کا مقصد ہی یہ تھا کہ تین سال میں اس بہانے سے نجم الدین صاحب کی تنخواہ دوگنی کرنے کا جواز پیدا کیا جا سکے۔ اب غلط املا کے انعام میں اٹھارہ سو تنخواہ پاتے ہیں۔ پروفیسر کا مکان۔ بجلی۔ پانی سب مفت ہے۔ ان کے عزیزوں کے لئے یونیورسٹی میں نئے نئے عہدے بنائے جاتے ہیں۔ اور اپنی سازشوں اور جوڑ توڑ کے ذریعے اساتذہ کی ترقی و تقرر سب ان کے اختیار میں ہے۔ جب انکی صاحبزادی کی شادی ہوئی تو باقاعدہ یونیورسٹی کے پروفیسر حضرات بکرا پیڑی لے جا کر دعوت کے لئے بکرے لے آئے۔ گھی اور مرچ مصالحے کا حساب کرتے ہوئے بھی یہی حضرات پائے گئے۔ جب پی۔ ایچ۔ ڈی کے فاضل پروفیسر اس طرح انکی خدمت کریں تو یونیورسٹی کے بیچارے چپراسی اور چھوٹے ملازم کس شمار و قطار میں ہیں۔

صدر شعبہ کیسے بنائے جاتے ہیں؟

موجودہ صدر شعبۂ ریاضی ڈاکٹر یحییٰ نے ۶۲ء میں پی۔ ایچ۔ ڈی پاس کیا۔ فروری ۶۳ء میں آپ ایک ہزار روپیہ ماہانہ پر انہیں ریڈر بنا کر لے آئے۔ اس وقت صدر شعبہ حنفی صاحب تھے جو ریڈر ہی تھے۔ ایک ہی ماہ بعد حنفی صاحب کو ہٹا کر ڈاکٹر یحییٰ کو صدر شعبہ بنا دیا گیا تاکہ انہیں صدر شعبہ ہونے کا الاؤنس سو روپے ماہوار مزید دیا جا سکے۔ اکتوبر ۶۴ء میں ان کو دو ترقیاں دے کر تنخواہ میں اور بھی اضافہ کر دیا گیا۔ نومبر ۶۵ء میں انھیں پروفیسر کے عہدے پر ترقی دی گئی۔ اور تنخواہ اتنی مقرر ہوئی کہ موصوف بڑے بڑے پرانے پروفیسر حضرات کو پیچھے چھوڑ گئے۔ ۶۹ء میں انکی تنخواہ دو ہزار ہو چکی ہے۔ یہ تیز ترقی شاید اسی وجہ سے ہوئی کہ نجم الدین صاحب اُن کے انتہائی گہرے دوست ہیں اور انکی اسلام پسندی اور آپ سے عقیدت مندی زمانے بھر پر عیاں ہے۔

ڈاکٹر الیاس مرحوم کا "گناہ"

ڈاکٹر عزیز احمد صاحب جن کی بیگم صاحبہ آپکی بیگم صاحبہ کی معالج تھیں کسی انتظامی نوعیت کی ملازمت سے بُلا کر ۶۳ء میں رجسٹرار بنا لیے گئے۔ جس وقت اُن کے لئے یہ اسامی مُشتہر کی گئی تو شرط پی ایچ ڈی کی رکھی گئی، تاکہ کوئی اور امیدوار اُن کے مقابلے پر نہ آئے۔ ویسے ایک اور پی ایچ ڈی اُمیدوار اس مقابلے میں شامل تھے لیکن آپ کی نگاہِ انتخاب پہلے ہی قسمتوں کا فیصلہ کر چکی تھی۔ ایک ہی سال بعد پروفیسر الیاس

> رجسٹرار صاحب پہلے تو آفس سپرنٹنڈنٹ تھے۔ آپ نے فوراً ایک نیا عہدہ جوائنٹ رجسٹرار کا پیدا کیا، کچھ دن بعد انہیں ترقی دینے کے لئے ایک نیا عہدہ اسٹیبلشمنٹ آفیسر کا بنایا گیا۔ بالآخر ان تمام سیڑھیوں کو پھلانگتے ہوئے۔ یہ رجسٹرار ہو گئے۔ یہ جس جس عہدوں سے گذرتے گئے، وہ عہدے ان کے ساتھ ہی ختم ہوتے گئے۔

مرحوم کو جو سیاسیات کے صدر شعبہ تھے ریٹائر کر دیا گیا حالانکہ ان کی مدتِ ملازمت میں توسیع بآسانی ہو سکتی تھی۔ لیکن انکا سب سے بڑا قصور یہ تھا کہ جب آپ نے حسین نقی کو یونیورسٹی سے نکالنا چاہا تو یہ خواہش پیدا ہوئی کہ پروفیسر موصوف بھی اسکے خلاف کچھ رپورٹ دے دیں۔ اس لئے کہ حسین نقی شعبہ سیاسیات کے ہی طالب علم تھے۔ لیکن پروفیسر الیاس نے اپنی عالمانہ دیانت اور وقار کے پیش نظر ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ پروفیسر الیاس کو اس نا وقت ریٹائرمنٹ کا اتنا غم ہوا کہ مستقل افسردہ رہنے لگے، اور کچھ ہی دن بعد دادرسی کے لئے اپنے خالق حقیقی کے پاس چلے گئے۔ اب پروفیسر عزیز اس احسان کے بدلے یونین کے انچارج کی حیثیت میں آپ کے زبردست آلۂ کار ہیں۔

ڈاکٹر ولی اللہ صاحب ۶۴ء میں پی ایچ ڈی کر کے آئے۔ اس وقت وہ لیکچرر تھے۔ اور ڈاکٹر بلال صدر شعبہ اور ریڈر، ان کے آتے ہی ایک پروفیسر اور ایک ریڈر کی اسامی مُشتہر کی گئی۔ پروفیسر کی اسامی کے لئے ڈاکٹر بلال نے عرضی دی، اور ریڈرشپ کے لئے ڈاکٹر ولی اللہ نے بلال صاحب تو بدستور ریڈر رہے۔ لیکن ولی اللہ صاحب کو ترقی دے کر ریڈر بنا دیا گیا اور تنخواہ بلال صاحب کے برابر مقرر کی گئی۔ اس تنخواہ کو بڑھانے کے لئے وہ الاؤنس بھی شامل کر لیا گیا جو ولی اللہ صاحب پانچ چھ سال پیشتر پاتے رہے تھے۔ کچھ ہی عرصہ بعد بلال صاحب اور ولی اللہ صاحب دونوں کو ایک ساتھ پروفیسر بنایا گیا، تاکہ بلال صاحب کی سینیارٹی ختم کر دی جائے اور آئندہ اس کا امکان رہے کہ کسی جواز کے ذریعے ولی اللہ صاحب کو صدر شعبہ بھی بنایا جا سکے۔

ولی اللہ صاحب ۶۴ء میں پی ایچ ڈی کر کے آئے تھے وہ لیکچرر سے کب کے پروفیسر ہو چکے۔ اسی سال ڈاکٹر بازمی ملک اور ڈاکٹر قادر بھی پی ایچ ڈی کر کے آئے تھے وہ لیکچررشپ سے ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکے بلکہ شعبۂ اسلامی تاریخ کے لیکچرر ڈاکٹر صابر ۶۱ء کے پی ایچ ڈی ہیں لیکن ابھی تک محض اس لئے لیکچرر ہیں کہ وہ انجمن اساتذہ کے سرگرم کارکن ہیں۔ اور آپ کے فیصلوں پر تنقید کرنے کی گستاخی کرتے رہتے ہیں حالانکہ ان کی تحقیقات برابر شائع ہوتی رہتی ہیں۔ انہوں نے مشہور ڈکشنری۔ اردو لغت مرتب کی ہے جس پر ادبی انعام بھی پا چکے ہیں۔ آپکے ادارے میں کتنے لوگ ہیں جو تحقیق و تدریس سے ان کی طرح دلچسپی رکھتے ہیں؟

ولی اللہ صاحب کے چھوٹے بھائی شمیم اللہ ۶۶ء میں مائیکروبیالوجی میں پی ایچ ڈی کر کے آئے اور بایوکیمسٹری میں ریڈر مقرر کر دیئے گئے۔ اب وہ صدر شعبہ ہیں۔

تین سال کی ترقیاں حاضر، ڈگری غائب

شعبۂ صحافت کے انعام الرحمٰن صاحب جو مقامی سند یافتہ ہیں ریڈر بنا دیئے گئے اور ساجد ذکریا صاحب جو باہر کی بھی ڈگری رکھتے ہیں ابھی تک لیکچرر ہیں۔ اس کی یہ وجہ تو نہیں کہ انعام الرحمٰن صاحب اخبارات میں آپ کی پبلسٹی کے لئے بہت سرگرم رہتے ہیں۔ جبکہ ساجد ذکریا بقول آپ کے "سوشلسٹ" ہیں۔

ڈاکٹر عادل حسین صاحب اور صلاح الدین صاحب شعبۂ سیاسیات کے قابل اساتذہ ہیں اور لیکچررشپ کی آخری حدوں پر پہنچ چکے ہیں تاہم ان کی ترقی کا کوئی امکان نہیں کیونکہ یہ لوگ بھی جامعہ میں آزادیٔ خیال کے علمبردار سمجھے جاتے ہیں اور یہ چیز آپ کے اقتدار کے لئے بہت بڑا چیلنج ہے۔

شعبۂ اقتصادیات کے مطلوب الرحمٰن صاحب بھی خدا معلوم کب سے لیکچرر ہیں۔ وہ گرانقدر تحقیقاتی کام بھی کر چکے ہیں، لیکن کسی صلہ اور ستائش سے محروم ہیں۔ یہ وہی صاحب ہیں جو آپ کے اقتدار کے بدترین دَور میں جب آپ کے متعلق کسی کو لب کشائی کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ اساتذہ کے بھرے جلسوں میں آپ کے خلاف قرار داد پیش کر دیا کرتے تھے۔ اور جنہوں نے اساتذہ کے ایک جلسے میں جس میں آپ بھی موجود تھے اسٹیج سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ ہم یونیورسٹی کی دھاندلیوں کے خلاف احتجاج کرتے ہیں اور منصفانہ نظام چاہتے ہیں۔

شعبۂ ریاضی کے اسلام پسند اُستاد اسلام الدین صاحب کو آپ نے شماریات کے ایک وظیفہ پر باہر بھیجا۔ حالانکہ آپ کے یہاں شماریات کے کئی اُستاد اس وظیفے کے متمنی تھے۔ اسلام الدین صاحب شاید ان مظلوموں کی بددعاؤں سے تین سال باہر رہے اور کوئی ڈگری نہ لے سکے۔ واپسی پر آپ نے ان کی ناکامی کے باوجود انہیں تین سالانہ ترقیاں عنایت کیں۔

"بذریعہ ڈاک" صدر شعبہ بن گئے

ڈاکٹر بقائی طالب علموں کے خلاف مارشل لاء کی عدالت میں گواہی دینے کی وجہ سے بہت مشہور ہیں۔ یہ صاحب چند سال پہلے پوسٹ آفس کے کسی عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے۔ آپ سے ان کی شناسائی دلّی سے چلی آتی ہے انہیں پہلے سوشیولوجی میں لیکچرر رکھا گیا۔ پھر کراچی یونیورسٹی سے ہی انہیں پی ایچ ڈی کرا دیا گیا۔ مارشل لاء کورٹ میں گواہی دینے کے بعد انہیں ریڈر بنا دیا گیا۔ اب موصوف صدر شعبہ ہیں۔ اور اساتذہ کے ہر جلسے میں آپ کے حق میں تقریر کر کے حقِ نمک ادا کرتے ہیں۔

اسی شعبہ میں ایک ڈاکٹر رؤف گذشتہ دنوں رکھے گئے ہیں۔ ابھی پی ایچ ڈی کر کے آئے ہیں لیکن آپ نے انہیں لیکچررشپ گریڈ کی سب سے زیادہ تنخواہ یعنی ایک ہزار پچاس روپیہ دیئے ہیں جبکہ یونیورسٹی کے قانون کے مطابق پی ایچ ڈی کے بعد آپ ساڑھے سات سو تنخواہ دیتے ہیں۔ ڈاکٹر رؤف نے اس احسان کے بدلے حالیہ انجمن اساتذہ کے اجلاس میں آپکی بھرپور حمایت کی۔ وہ اُن چودہ اساتذہ میں شامل تھے جنہوں نے آپ کے حق میں ووٹ دیئے جبکہ آپ کے مخالفین کی تعداد ایک سو تینتالیس تھی۔

فلسفہ کے اُستاد منظور احمد جب یونیورسٹی میں لیکچرر رکھے گئے تھے تو اُن کے ساتھ انٹرویو میں دو اُمیدوار اور شامل تھے۔ ایک خاتون علیگڑھ یونیورسٹی کی پی ایچ ڈی تھیں، ایک صاحب لندن یونیورسٹی سے اعزاز کے ساتھ آنرز پاس کر کے آئے تھے۔ منظور صاحب محض کراچی یونیورسٹی کے سیکنڈ کلاس M.A تھے۔ لیکن آپ نے منظور صاحب کو ان دو زیادہ باصلاحیت اُمیدواروں کے مقابلے میں منتخب کیا۔ اور پھر ایک ہی سال بعد وظیفہ دلوا کر باہر بھیج دیا۔ حالانکہ یونیورسٹی کے قوانین کے مطابق تعلیمی رخصت اتنی جلد نہیں مل سکتی۔ واپسی پر ان کو ریڈر بنا دیا گیا، اس کے باوجود کہ اُن کے خلاف کچھ سنگین الزامات بھی تھے اس طرح چند ہی سال کے عرصے میں شعبے کے سب سے جونیئر لیکچرر صدر شعبہ بن گئے۔ اور اُنکے اُستاد اُن کے ماتحت ہو گئے۔

اپنوں کے لئے نئے شعبے کھول دیئے

آپ نہ صرف یہ کہ اپنے آدمیوں کے لئے اسامیاں پیدا کرتے ہیں بلکہ اگر زیادہ خوش ہوں تو ان کے لئے پورے شعبے قائم کر دیئے جاتے ہیں۔ اصولی بات یہ ہے کہ نئے شعبے ادارے کی علمی ضرورت اور مالی حالات کے پیش نظر قائم کئے جاتے ہیں۔ آپ کبھی تو یہ کہتے ہیں کہ یونیورسٹی میں فنڈ کی اتنی کمی ہے کہ کوئی جونیئر لیکچرر تک نہیں رکھا جا سکتا لیکن اس کے ساتھ ہی انتہائی فراخدلی سے کوئی نیا شعبہ قائم کر دیا جاتا ہے۔ نجم الدین صاحب کے دوست شمس الضحیٰ صاحب داؤد خیل کی پنسلین فیکٹری سے مائیکرو بیالوجی میں ریڈر بنا کر لائے گئے۔ پھر ان کے لئے فارمیسی کا پورا شعبہ قائم کر دیا گیا۔ جبکہ موصوف فارمیسی میں کوئی سند ہی نہیں رکھتے۔ اسی طرح ڈاکٹر شمیم فاروقی کے لئے جو اپنے شعبے کے بہت جونیئر اُستاد تھے، ایک نیا شعبہ (GENETICS) قائم کر کے انہیں اس کا صدر بنا دیا گیا۔ میجر آفتاب صاحب بھی ایک ایسے شعبے کے صدر ہیں جس کا کہیں وجود نہیں۔ اور اس حیثیت سے اپنی تنخواہ کے علاوہ دو سو روپیہ ماہوار خصوصی الاؤنس پاتے ہیں۔ یہ شعبہ ڈیپارٹمنٹ آف نیچرل سائنسز کہلاتا ہے۔ خود آپ شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ کے سربراہ ہیں۔ جس پر کثیر رقم خرچ ہوتی ہے۔ اور جس میں غالباً یونیورسٹی کی وضع کی ہوئی اصطلاحات پر محض نظرثانی ہو رہی ہے۔ اس شعبے کا سب سے بڑا کارنامہ آپ کی کتاب کی اشاعت ہے۔ اس میں بھی ہزار طرح کے الاؤنس ہیں جو اپنے پسندیدہ لوگوں کو دیئے جاتے ہیں۔ میجر صاحب یوں بھی بحیثیت محتسب آپ کے لئے بہت اہم شخصیت ہیں۔ آپ کے اقتدار کے ابتدائی دور میں ان ہی نے آپ کے خلاف لغاوتوں کو فرد کر کے جامعہ میں امن و سکون بحال کیا۔ یہ اُن کا حسنِ کارکردگی ہے کہ داخلے کے اُمیدوار باغی عناصر کی فہرست داخلے سے پہلے ہی آپ کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ اور جامعہ کے دروازے ان پر بند کر دیئے جاتے ہیں۔ بلکہ یونیورسٹی کا گٹاپو یعنی پراکٹوریل سسٹم میجر صاحب کے ہی فکر رسا کا نتیجہ ہے جس کے نتیجے میں ہر سال طلباء داخلوں سے محروم کئے جاتے ہیں، سیاسی نظریات کی بناء پر جامعہ سے نکال

مددگار لیکچراروں کی اسکریننگ کا ایک نیا طریقہ؛ ملازمت برسوں تک عارضی رہتی ہے

دیئے جاتے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ یہ شعبے انتظامی معاملات میں اہم خبریں فراہم کر کے شہر کی خفیہ پولیس کے بھی ہاتھ بٹاتا رہتا ہے۔ میجر صاحب پہلے پروکٹر تھے، انہوں نے بڑی دھاک سے حکومت کی۔ اب جب سے آپ کے خلاف تحریکیں زور پکڑ رہی ہیں، آپ نے انہیں دوبارہ کوتوال شہر مقرر کر دیا ہے۔ میجر صاحب کا پہلا دور طلوعِ آفتاب کا دور تھا۔ خدا کرے یہ غروبِ آفتاب کا دور ہو۔

بڑھاپے میں عُمر کم ہو گئی

شعبۂ تادیب نے نہ صرف طلبار کو ڈرانے دھمکانے اور معافی نامے لکھوانے کا فرض اپنے ذمّہ لے رکھا ہے۔ بلکہ اساتذہ تک اس سے ہراساں رہتے ہیں۔ جو لوگ آپ کے دربار میں بیٹھنے کا شرف رکھتے ہیں وُہ ہر قانون سے بالاتر ہیں۔ وہ جب چاہیں تعلیمی رُخصت پر باہر چلے جائیں۔ ان کے لئے ہر قاعدہ و قانون بیکار ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر نظام جو شعبۂ نباتیات میں ریڈر ہیں بار بار تعلیمی رخصت پر باہر جا چکے ہیں۔ ان کے متعلق یہ سنا گیا ہے کہ انہوں نے کوئی کائی دریافت کی ہے جس کا نام آپ کے نام گرامی پر "اگائی قریشیائی" رکھا ہے۔ ویسے ہمارا خیال ہے کہ آپ کو کم از کم کائی کا نام اپنے نام پر رکھنے کی اجازت انہیں نہیں دینی چاہیئے تھی۔ اس لئے کہ اظہارِ عقیدت کے اس طریقے میں قطعًا کوئی خوش مذاقی نہیں۔

نظام صاحب کے متعلق یہ بات بھی مشہور ہے کہ ان کی عمر سروس بک میں کچھ اور ہے اور پاسپورٹ میں کچھ اور درج ہے۔ سُنا ہے پاسپورٹ پر یہ اصلاح ایک وظیفہ کے حصول کی خاطر کی گئی تھی جس کے لئے اُن کی عمر زیادہ ہو چکی تھی اور اس میں کمی کرنی ضروری تھی، ورنہ وظیفہ نہ ملتا، عمر کی کمی کے سلسلے میں شعبہ اسلامی تاریخ کے صَدر بھی بہت مشہور ہو چکے ہیں۔ انہیں اپنے ریٹائرمنٹ سے محض دو ماہ پیشتر اچانک یہ انکشاف ہوا کہ ان کی عمر اس عمر سے تین سال کم ہے جو وہ آج تک سمجھتے رہے تھے۔ نتیجتًا انہوں نے ایک حلف نامہ داخل کر دیا کہ ان کی عمر میں تین سال کمی کی جائے اور سنڈیکیٹ نے انتہائی سادگی سے اس حلف نامے کو منظور کر لیا اور یوں ان کی مدتِ ملازمت میں تین سال کی توسیع خود بخود ہو گئی۔

تعلیمی رخصت کے معاملے میں جامعہ نے ڈاکٹر یحیی کی بیگم کے ساتھ بھی بہت فراخدلی سے کام لیا ہے۔ آپ مددگار لیکچرار مقرر ہوئیں اور فورًا ہی آکسفورڈ بھیج دی گئیں۔ وہاں سے واپسی پر فورًا ہی آپ کو مستقل طور پر لیکچرر مقرر کر دیا گیا تاکہ وہ ان لوگوں سے سینئر ہو سکیں جو عنقریب پی ایچ ڈی کر کے آنے والے تھے۔ اس انٹرویو میں خود ڈاکٹر یحیی اور فصیح الدین صاحب بطورِ ماہرینِ مضمون کے شامل تھے۔ اس انٹرویو کے ایک ہفتہ بعد ہی ڈاکٹر یحیی سے ان کی دھوم دھام سے شادی ہو گئی۔ ایک سال بعد وہ دوبارہ تعلیمی رخصت پر باہر بھیج دی گئیں۔

اسی طرح آپ تقرر کی شرائط بھی شخصیات دیکھ کر بدل دیتے ہیں۔ مثلًا ڈاکٹر عزیز کو رجسٹرار بنانا تھا تو شرط ڈاکٹریٹ کی ڈگری کی تھی۔ نجم الدین صاحب کا تقرر منظور تھا تو وہ شرط ختم کر دی گئی۔

مددگار لیکچرر آپ سے اس بات کے بھی شاکی ہیں کہ آپ انہیں چار چار سال تک ایڈہاک (عارضی) بنیاد پر ملازم رکھتے ہیں اور ملازمت مستقل نہیں کرتے۔ ہر چھ ماہ بعد چھ ماہ کے لئے ان کی مدتِ ملازمت میں توسیع کر دی جاتی ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ آپ نے یہ انتہائی کامیاب اسکریننگ کا طریقہ نکالا ہے۔ تاکہ جس وقت آپ کی شان میں کوئی گستاخی کرے یا گستاخی کا ارادہ کرے، آپ اسے بغیر کسی طویل قانونی طریقہ کار کے آسانی سے برطرف کر سکیں۔ اور وہ مستقل ملازمت کے حقوق کا دعوٰی بھی نہ کر سکے۔ آپ نے شاید یہ کبھی سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ اس صورتِ حال میں جبکہ ہمہ وقت اساتذہ کے سر پر برطرفی کی تلوار لٹکی رہے وہ کس طرح درس و تدریس سے انصاف کر سکتے ہیں۔ لیکن آپ کے نشۂ اقتدار نے کبھی آپ کو ان امور کی طرف متوجہ ہونے کی مہلت ہی نہیں دی۔ اور بھلا آپ اساتذہ کی ملازمت کو اگر مستقل کر دیا کرتے تو پھر بیک وقت ۵۵، اساتذہ کو برطرف کرنا کس طرح ممکن تھا جیسا آپ نے ۶۷ء میں کیا۔

اساتذہ نکالے گئے، پھر واپس آ گئے

ان اساتذہ کی نہ یہ خطا تھی کہ اپنے مضمون میں نالائق تھے اور نہ یہ کہ محنت سے کام نہیں کرتے تھے۔ بلکہ محض یہ خطا تھی کہ انجمن اساتذہ کے ایک جلسے میں انہوں نے انتظامیہ کی یہ شکایت کی کہ ایک جلسہ تقسیم انعامیں مددگار لیکچرر کو جونیئر سمجھ کر نہیں بلایا گیا۔ جبکہ تمام پروفیسر، ریڈر، اور لیکچرر مدعو کئے گئے تھے۔ اتنی سی شکایت کی آپ نے اتنی بڑی سزا دی۔ اور جواز یہ پیش کیا کہ اب اس طریقہ تقرر کو ختم کر کے مستقل بنیاد پر پھر سے اسامیاں پُر کی جائیں گی۔ لیکن جناب وہ طریقہ تو چند دن بعد پھر رائج ہو گیا۔ بلکہ آج تک اسی انداز سے تقرر ہو رہے ہیں۔

ایک مرتبہ آپ نے یہ بھی جواز پیش کیا کہ برطرف کئے جانے والے لیکچرر ایسے اساتذہ کی جگہ کام کر رہے تھے جو باہر گئے ہوئے تھے۔ اور چونکہ وہ اساتذہ باہر سے واپس آ گئے اس لئے عارضی ملازمین نکال دیئے گئے۔ لیکن دیکھئے، کتنی دلچسپ بات ہے کہ جس سال آپ انجمن اساتذہ سے خفا ہوئے اُسی سال آپ کے وہ پچیس اساتذہ ڈگریاں لے کر واپس آ گئے، یہ سانحہ نہ اس سے پہلے کبھی ہوا تھا نہ اس کے بعد ہوا۔

آپ نے گزشتہ دنوں اس خبر کی تردید کی تھی کہ امیر جماعتِ اسلامی کی حیثیت سے آپ کے تقرر کا امکان ہے، ہو سکتا ہے کہ آپ امیر جماعتِ اسلامی بننے کا ارادہ نہ رکھتے ہوں لیکن جماعتِ اسلامی سے آپ کے اظہارِ لاتعلقی پر یقین آنا آسان نہیں۔ ویسے سیاسی سرگرمیوں میں حصّہ لینے کے ہم مخالف نہیں۔ پھر آپ جیسے باشعور افراد پر تو یہ پابندی عائد ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ ہم آپ کو یاد دلائیں تو اساتذہ پر بھی یونیورسٹی آرڈیننس کے ذریعے سیاست کے دروازے بند کرنے کے آپ ہی ذمّہ دار ہیں۔ ہم تو خود یہ کہتے ہیں کہ طلبار اور اساتذہ کو سیاسی سرگرمیوں میں حصّہ لینے کی جب تک پوری آزادی نہیں ہو گی، اس ملک میں جمہُوری نظام کامیابی سے نہیں چل سکتا۔ لیکن یہ کیا بات ہے کہ آپ کی جامعہ میں یونیورسٹی آرڈیننس محض سوشلسٹ اساتذہ کی گرفت کرتا ہے جماعتِ اسلامی سے متعلق طلبار کو اور اساتذہ کو نہ صرف ہر قسم کی آزادی بلکہ آپ کی سرپرستی حاصل ہے۔ اور "اسلام" کی خاطر آپ ہر مکروہ حیلے سے کام لیتے ہیں۔

اور آپ کے اسلام پسند مددگار

یونین کے الیکشن میں جمعیت طلبار کے اُمیدواروں کو جتوانے کے لئے دھاندلی کروائی جاتی ہے۔ جمعیت طلبار کے سرگرم کارکنوں کو ڈویژن اور پوزیشن دلوا کر مُلازم رکھا جاتا ہے۔ اور پوزیشن نہ آ سکے تب بھی ملازمت دی جاتی ہے۔ وظائف دے کر باہر بھجوایا جاتا ہے۔ انوار کاظمی، سلطان چاولہ، جاوید اکبر انصاری اسی ضمن میں آئے ہیں۔ اور اب سنا ہے اعجاز شفیع گیلانی بھی لیکچرر مقرر کر دیئے گئے ہیں لیکن فی الحال اس تقرر کو اس لئے صیغۂ راز میں رکھا جا رہا ہے کہ وہ الیکشن میں اپنا پورا اثر استعمال کر سکیں۔ اساتذہ قربانی کی کھالیں جمع کرتے ہیں۔ نظریۂ پاکستان فنڈ جمع کرتے ہیں۔ آپ کے اساتذہ نے ۳۱۳ علمار کے فتوی کفر پر بھی دستخط کئے۔ یوم شوکتِ اسلام کو کامیاب بنانے کی اپیل بھی باقاعدہ آپ کے اساتذہ نے اخباروں میں شائع کرائی۔ جس میں بس وہی نام شامل تھے جو گاہے گاہے آپ کے حق میں دستخطوں کی مہم چلاتے رہتے ہیں۔ خورشید احمد صاحب شعبہ معاشیات میں اُستاد بھی تھے اور باقاعدہ چراغِ راہ کے مدیر بھی۔ کوکب صاحب "CRITERION" کی ادارت کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ کیا یہ حکومت کے قانون کی خلاف ورزی نہیں۔ لیکن آپ کو تو حکومت کے قوانین بھی سوشلسٹ اساتذہ کی سرکوبی کے لئے یاد آتے ہیں۔ "صالحین" پر ان کا اطلاق نہیں ہوتا۔ یونین میں سورش کاشمیری اور الطاف حسن قریشی صاحب مدعو ہوتے ہیں۔ اگر آپ خود جماعتِ اسلامی کے ہم خیال ہیں تو آپ کو یہ

افسانہ

نئے سندھ

بدرالزماں

"نئے سندھ"..... آواز اس سے یوں ٹکرائی جیسے کوئی ٹھوس چیز تھی۔ اچانک اس کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور پھر اس نے اپنے ہونٹ سختی سے بند کر لئے اتنی سختی سے کہ مسکراہٹ ایک "تلخ" تاثر دینے لگی.....

اس نے قدم ذرا تیز اٹھانے شروع کئے تھے کہ نظر سامنے دیوار پر پڑی "سندھ سندھیوں کا ہے، پنجابی چل جاؤ".....اس کے قدم کچھ اور تیز ہوگئے تب برابر سے گزرنے والے دو آدمیوں میں سے ایک بولا ون یونٹ تو ٹوٹ گیا لیکن یہ لوگ جاتے نظر نہیں آتے۔!

اس کے قدم شاید آپ ہی آپ دھیمے ہوگئے تھے۔

تب دوسرے آدمی نے انکشاف کیا "تم جانے کی بات کرتے ہو! ذرا غریب آباد میں جاکر دیکھو۔ ساری کی ساری آبادی مہاجروں اور پنجابیوں کی ملے گی۔۔!...اور مزے کی بات تو سنو۔ کہتے ہیں سندھ تو ہمارا ہے۔!

پہلا آدمی ہنسا۔ اور اس نے محسوس کیا کہ اسکی ہنسی میں معصومیت تھی۔

اب ان آدمیوں کا فاصلہ چونکہ بڑھ گیا تھا لہٰذا آواز صاف نہ سنائی دیتی تھی، وہ قریب ہی پان بیڑی والی کیبن پر رک گیا۔ کیبن پر پہلے سے تین آدمی محو گفتگو تھے، اس نے تینوں کا سرسری جائزہ لیا وہ ادھیڑ عمر کے مزدور پیشہ لوگ نظر آتے تھے، کیبن والے بڑے میاں پان کی گلوری منہ میں دبائے ان تینوں کو کچھ سمجھا رہے تھے "میاں تم لوگ دراصل اقلیت میں ہو اگر عزت سے یہاں رہنا ہے، تو میری مانو، سب کے پہلے اپنی ایک جماعت بناؤ۔ جماعت، بڑی بڑی آنکھوں، اور سوکھے جھریوں دار چہرے والے شخص نے فوراً بڑے میاں کی بات درمیان سے کاٹ دی۔ چچا میاں تم جماعت کی بات کرتے ہو لیکن وہ تو ہمیں سندھ سے نکال رہے ہیں۔

دوسرا آدمی اپنی دو پلی ٹوپی کو درست کرتے ہوئے بولا "جو تم کہتے ہیں، سندھ میں رہنا ہے تو سندھی بن جاؤ۔ بھلا کوئی ان سے پوچھے، ہم سندھی کیسے بن سکتے ہیں۔؟

"تیسرا آدمی جو چپ چاپ کھڑا سنجیدگی سے ان کی باتیں سن رہا تھا کچھ اس معصومیت سے ہنسا جیسے کسی نے اچانک اسے سندھی بن جانے کی پیش کش کر دی ہو۔ پھر ذرا سنجیدگی سے بولا "میں تو ان لوگوں سے صرف یہ پوچھتا ہوں کہ جب روزی اللہ دیتا ہے تو بھلا ہمارے یہاں رہنے سے ان کو کیا نقصان ہوتا ہے؟

باقی تینوں نے اسکی تائید کی۔ اور کہا! ۔ بالکل۔ بالکل سچ ہے ۔۔

اس نے ان چاروں کی طرف دیکھا۔ کتنی معصومیت تھی ان کی باتوں میں! ۔ بیچارے عوام ۔ اور پھر وہ بغیر سگریٹ خریدے آگے چل پڑا۔ وہ اس وقت کتنی بے چارگی محسوس کر رہا تھا، اسے ان باتوں سے کتنی نفرت تھی۔ کتنی شدید۔ پھر اس نے اچانک خود سے سوال کیا، "تو کون ہے، آخر کون ہے۔؟ میں تو سندھی ہوں" اب وہ اپنے آپ سے مخاطب تھا۔ بھلا میں اور کیا ہو سکتا ہوں، میں سندھی نہیں ہوں تو بھلا اور کیا ہو سکتا ہوں؟ اسکی نظر سامنے دیوار پر پڑی، تب وہ ٹھٹھک گیا۔

نئے سندھی پرانے سندھی بھائی بھائی.....

نہیں..... نہیں میں نیا سندھی ہرگز نہیں ہوں۔ میں نے تو یہاں جنم لیا ہے۔ میری تو اس دھرتی میں نال گڑی ہے۔ میں صرف سندھی ہوں، نہ نیا نہ پرانا۔ بس ایک سندھی۔ وہ بڑبڑایا۔

..... "نواب مظفر جیت گئے۔" کسی نے خوشی سے چیخ کر دوسرے کو اطلاع دی۔ دوسری طرف سے آواز آئی "چلو اچھا ہوا ایک مہاجر تو جیتا" ۔ اور اس کی نظر سامنے دیوار پر پڑی۔ "مہاجر، پنجابی، پٹھان متحدہ محاذ زندہ باد": اس نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔ تب اس کے کان میں ایک سرگوشی سنائی دی ۔ یہ ہیں وہ لوگ جو نئے سندھی کو کبھی پرانا نہ ہونے دیں گے۔ یہ ہیں وہ لوگ جو تعصب اور نفرت کی بنیاد پر اسمبلی کی سیٹ حاصل کرتے ہیں۔ تب اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ بیچارے معصوم عوام۔

اب وہ کیفے میں بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا، اس کی پیشانی پر فکر کی موٹی سی لکیر ابھر آئی تھی، پھر اس نے اپنے کانوں میں سرگوشی سنی "روزی تو اللہ دیتا ہے پھر بھلا ہمارے یہاں رہنے سے ان کو کیا نقصان؟ اور ساتھ ہی اس محنت کش کا معصوم چہرہ اسکی آنکھوں میں گھوم گیا۔ تب اس نے خود سے سوال کیا، بھلا ایک سبزی بیچنے والے کو ایک دھوبی سے کیا نقصان پہنچ سکتا ہے ایک جوا بچہ لگانے والے کو ایک پالش کرنے والے سے کیا نقصان ہو سکتا ہے؟ اور ایک پھیری کرنے والے کو ایک کسان سے کیا نقصان ہو سکتا ہے؟ وہ خود سے سوال پر سوال کئے جا رہا تھا۔ نہیں ایک مزدور کو دوسرے مزدور سے۔ ایک کسان کو دوسرے کسان سے، ایک محنت کش کو دوسرے محنت کش سے اور ایک غریب کو دوسرے غریب سے کوئی نقصان نہیں ہو سکتا۔ یہ سب جھوٹ ہے فریب ہے۔ وہ مسلسل خود سے اونچے لہجے میں باتیں کر رہا تھا۔ ہاں ایک غریب کو ایک امیر سے ضرور نقصان پہنچ سکتا ہے بلکہ ایک امیر سے سو غریبوں کو نقصان پہنچ سکتا ہے..... اور ..... اور پہنچ رہا ہے، اس کا چہرہ شدت جذبات سے سرخ ہوگیا تھا، وہ مسلسل بڑبڑا رہا تھا.....

تب اس نے دیکھا چھ سات کالج کے طالب علم کیفے میں داخل ہوئے اور سامنے والی میز کے گرد بیٹھ گئے، اس نے ایک سرسری نظر ڈالی، ان میں سے بیشتر چہرے اسکے جانے پہچانے نظر آئے۔ اور وہ اپنے خیالات کے تانے بانے سلجھانے لگا۔ بھلا عوام کو عوام سے کیوں نفرت ہونے لگی؟ ایک عام آدمی کو دوسر

حق کس نے دیا کہ اس کی تبلیغ کے لئے ہر جائز و ناجائز طریقے اور ہر دھونس اور دھاندلی کو روا رکھیں ۔ یہ پوری قوم کی یونیورسٹی ہے۔ اگر کسی تعلیمی ادارے پر جماعت کو مسلط کرنے کا ایسا ہی شوق ہے تو آپ اپنے امیر کو مشورہ دیں کہ الیکشن ہارنے کے بعد اب وہ ایک علٰحدہ یونیورسٹی قائم کر دیں جو ان کے لئے چنداں دشوار نہیں ۔ امریکن ڈالر جس کی پشت پر ہو وہ بس الیکشن ہی نہیں جیت سکتا اور سب کچھ کر سکتا ہے۔

یونیورسٹی کی خوبصورت رشدگاہ کی طرف سے بھی اکثر ہمیں بڑی تشویش ہوتی ہے۔ کہ یہ جگہ چمگادڑوں کا مسکن بننے کے لئے تو نہیں ہے ۔ اور خصوصیت سے اس کے لئے تو ایک کلرک اور ایک چپراسی کا الگ تقرر ہوا ہے۔ وہ کہاں رہتے ہیں اور کیا کام کرتے ہیں۔

—— گفتگو بہت طویل ہو گئی۔ آخر میں ہم آپ سے محض یہ گزارش کریں گے کہ آپ بہت عرصہ تک ہمارے ساتھ مذاق کر چکے۔ اب دائمی مستعفی ہو جائیں۔ آپ کے جانے کے بعد جو سیاہ قوانین اور غیر جمہوری اور لاقانونی روایات آپنے ڈالی ہیں وہ بہت دنوں آپ کی یاد دلاتی رہیں گی۔ تاریخ میں پہلی دفعہ یہ اعزاز آپ کو ہی ملنا تھا کہ اساتذہ بھی وائس چانسلر سے استعفیٰ طلب کریں۔ فی الحال تو وہ آپ کو عزت نفس کا واسطہ دے کر کہہ رہے ہیں اسے غنیمت جانیے۔

عام آدمی سے کیا ڈر ..... اور پھر جہاں سب کے مفاد ایک ہوں وہاں آپس میں بیزاری کیسی ؟ اُس نے خود سے پوچھا اور پھر سامنے رکھی ہوئی چائے کا ایک بڑا سا گھونٹ لے کر آنکھیں بند کرلیں، اچانک کسی آواز نے اُسے اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ کوئی کہہ رہا تھا۔ ہونہہ! تم کہتے ہو ہم عوام میں زہر بھر رہے ہیں، لیکن ہمارے ساتھ جو مظالم ہوتے ہیں، ذرا انہیں تو گنو۔ اگر تم گنتے گنتے تھک نہ جاؤ تو کہنا ۔!

اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اور آواز کی سمت دیکھا، وہ اس کا جانا پہچانا چہرہ تھا اور ان چھ میں سے ایک جو تھوڑی دیر پہلے یہاں آئے تھے ۔ آواز پھر ابھری، ذرا تم ہی سوچو کہ جب پنجاب سے کوئی افسر ہمارے یہاں آتا ہے تو اس کا چپراسی اور حتیٰ کہ بھنگی بھی پنجاب سے ساتھ آتا ہے، ذرا تم ہی غور کرو کہ وہ کس طرح ہمارے گھر میں بیٹھ کر ہمارے لئے ہی بے روزگاری عام کرتے ہیں !"۔

اس نوجوان نے ابھی اپنی بات پوری نہ کی تھی کہ دوسرا بول اٹھا، پنجاب نے بائیس برس میں جس طرح ہمیں لوٹا ہے وہ تو ہم ہی جانتے ہیں، پانی پنجاب سے ہو کر سندھ پہنچتا ہے اس لئے اس نے بڑے بڑے ڈیم بنا کر ہمارا خیال کئے بغیر اپنی ضرورت سے کہیں زیادہ پانی روک لیا نتیجہ یہ کہ پنجاب کے زمینداروں اور چودھریوں کے عیش آگئے۔ دوسرے حکومت کی اسکیم کے تحت جتنی انڈسٹری سندھ میں لگنی تھی وہ سب نہیں تو آدھی سے زیادہ پنجاب میں لگ گئی، اس طرح وہاں کے خوشحال طبقے نے ہماری دولت دونوں ہاتھوں سے سمیٹی، تیسری بات یہ کہ پنجاب کی افسر شاہی کی بدولت حکومت سے جائز و ناجائز مراعات ایک خاص طبقہ کو حاصل ہوئیں۔ چوتھے یہ کہ سندھ کی زمینیں جو بیراج پر تھیں ۔ پنجاب کے با اثر طبقہ کو الاٹ کردی گئیں تاکہ سندھ میں رہ کر سندھ والوں کا استحصال کریں۔ ان میں فوج اور سول کے ریٹائرڈ افسر بھی شامل ہیں۔ پانچویں بات یہ کہ ون یونٹ بنا کر ہمیں اُلّو بنایا اور اپنا اُلّو سیدھا کیا۔

****

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد' وہ پھر بولا۔ اب کے اس کی آواز میں بلا کا ارتعاش تھا، اور چہرے پر انتہائی نفرت۔ "میں تو کہتا ہوں پنجاب غاصب ہے، پنجاب ظالم ہے، پنجاب کے عوام قابلِ نفرت ہیں، اور پنجاب.....

اس کے آگے وہ کچھ نہ سُن سکا۔ اس نے دوبارہ آنکھیں بند کرلیں، اور بچی ہوئی ٹھنڈی چائے کو ایک ہی گھونٹ میں نگل لیا۔ اس نے محسوس کیا گھونٹ انتہائی تلخ تھا۔ لیکن کیا خبر اس کے منہ کا ذائقہ تلخ رہا ہو۔ اس نے سوچا اور ابھی اسی تجزیہ میں اُلجھ ہی رہا تھا کہ دوبارہ اسی جانب سے ایک انجانی آواز نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ اس نے اپنی نیم وا آنکھوں میں اس آواز کی طرف دیکھا۔ وہ کوئی نیا چہرہ تھا۔ کم از کم اس کیلئے نیا، اس نے ذرا غور سے نگاہ کی وہ ایک دُبلا پتلا، کالے بالوں اور بھوری آنکھوں والا سنجیدہ سا لڑکا تھا، عمر پچیس چھبیس سال دکھتی تھی، آنکھوں میں چمک اور ماتھے پر سوچ کی موٹی سی لکیر تھی، اس کی آواز میں ارتعاش بھی نہ تھا اور نہ جذبات کی شدت تھی، البتہ اس آواز میں پختگی جھلکتی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا، دوستو! ہمارے ساتھ ظلم بہت ہوئے، ہمارے عوام کے ساتھ ناانصافیاں بہت ہوئیں۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ گزشتہ بائیس برس میں ہمارے ملک پورے ملک کے عوام کا خون اسلام کے نام پر چوسا گیا۔ لیکن یہ بھی ایک اٹل حقیقت ہے کہ پنجاب، سرحد، بلوچستان اور سندھ کے عوام سب مظلوم ہیں ۔!

****

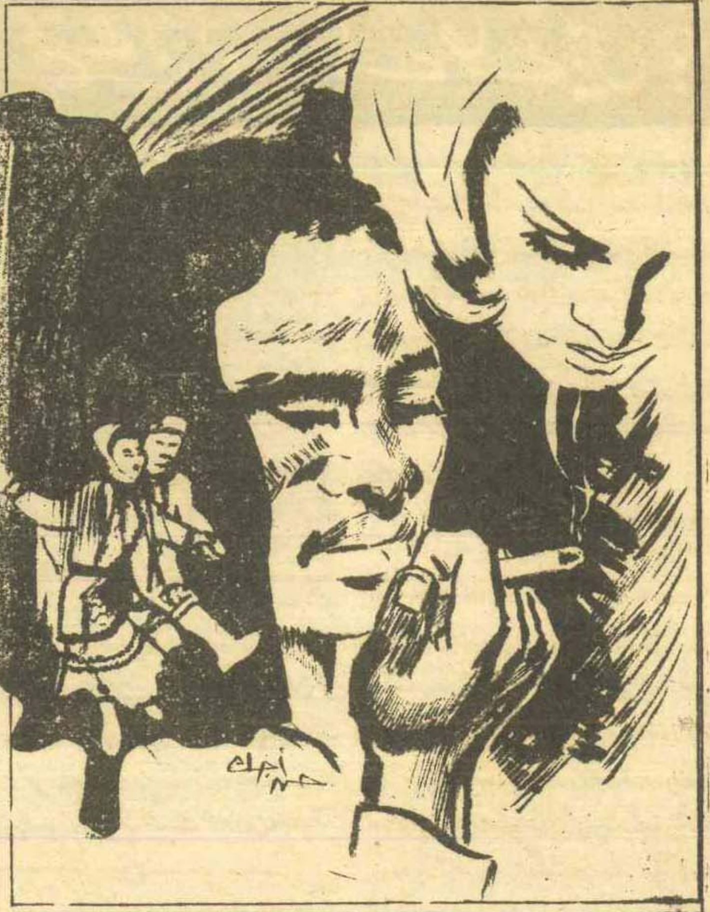
اس نے اپنی نیم وا آنکھیں پوری کھول دیں اور اس نوجوان کو غور سے دیکھا جو موٹی کھادی کے لباس میں جاذبِ نظر لگ رہا تھا۔ آواز پھر گونجی ۔ ساتھیو! یاد رکھو عوام ہی دراصل پرولتاریہ قوت کا دوسرا نام ہے، اور پرولتاریہ چاہے کسی صوبہ یا کسی خطہ سے ہو، ہمارا خاندان ہے۔ عوام ایک ہی خاندان کا نام ہے، چاہے وہ سرحد میں ہو یا بلوچستان میں، سندھ میں ہو یا پنجاب میں۔ دراصل وہ سب ایک ہی خاندان کے لوگ ہیں...... چند لمحے کی خاموشی کے بعد اس کی آواز پھر ایک کوندے کی طرح لپکی، جس میں چمک بھی تھی اور جرأت بھی۔ ..... ابھی چند لمحے پہلے ہمارے ایک ساتھی نے سندھ سے ہونے والی ناانصافیاں بیان کی ہیں۔ ذرا آپ لوگ خود ہی سوچیں، پنجاب نے اپنی ضرورت سے زیادہ پانی روکا جو سندھ کے ساتھ یقیناً" ایک ناانصافی ہے لیکن بقول ہمارے ہی دوست کے، پنجاب کے زمین داروں اور چودھریوں کے عیش آگئے ـــ سندھ کی انڈسٹری پنجاب میں لگائی گئی اس طرح وہاں کے خوشحال طبقے نے پورا فائدہ اُٹھایا۔ پنجاب کی افسر شاہی سے ظاہر ہے کہ وہاں کے ایک خاص طبقہ کو مراعات ملیں۔ سندھ میں بیراجوں کی زمینیں بڑے بڑے افسروں اور با اثر لوگوں کو الاٹ کی گئیں، فائدہ ظاہر ہے کن لوگوں کو پہنچا۔ اور ون یونٹ بنا کر فائدہ جن خاندانوں کو پہنچایا گیا اور جن سرمایہ داروں کے سرمایہ کو کئی گنا بڑھایا گیا اور افسر شاہی کے ہاتھوں چھوٹے صوبوں کا استحصال کرایا گیا وہ بھی کچھ آپ سے چھپا ہوا نہیں۔ اب آپ خود ہی فیصلہ کیجیے کہ سندھ سے ہونے والی زیادتیوں کے عوض پنجاب کے عوام کو کیا ملا۔ چھوٹے صوبوں کا جو استحصال ہوا، اس میں عوام کا کونسا مفاد شامل تھا۔

"میں آپ لوگوں کو یقین دلاتا ہوں کہ کوئی بھی سرمایہ دار چاہے وہ سندھ کا ہو یا پنجاب کا یا دُنیا کے کسی بھی خطے کا، وہ کبھی یہ نہیں چاہے گا کہ اُس کے لُوٹ کھسوٹ کا مال عوام تک پہنچے ـــ اور فرض کیجیے کہ بھوک اور افلاس میں جکڑے ہوئے عوام تک اگر کچھ پہنچ بھی گیا تو اس میں عوام کا ہرگز کوئی قصور نہیں۔ یہ تو بالکل ایسی بات ہوگی جیسے ہم کسی فاقہ زدہ آدمی سے یہ اُمید رکھیں کہ وہ روٹی چرا کر نہ کھائے۔

ہال میں خاموشی چھا گئی۔ تب اسنے ان سب کی جانب دیکھا جن کے چہروں پر اب نفرت کے بجائے معصوم طمانیت آگئی تھی۔ چند لمحے خاموشی میں گزر گئے، تب ہی حرارت سے بھرپور آواز پھر اُبھری۔ دوستو! ہماری آئیڈیالوجی میں ہر چیز کے دو رُخ ہوتے ہیں۔ پہلا پرولتاری یا عوامی اور دوسرا بورژوائی رُخ، اور یہ دوسرا رُخ انتہائی مکروہ اور گھناؤنا ہے۔ باقی رہی نیشنلزم تو وہ ہر قوم کے لئے بیش بہا قوت کا سرچشمہ ہے لیکن یہاں بھی ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ہم کونسی قوت کو رہبر بناتے ہیں۔ اس کی آواز چند لمحے کے لئے رُک گئی، پھر اس نے اُسی متین اور پُر یقین لہجے میں کہا... ساتھیو! ہمیں بورژوا نیشنلزم نہیں چاہیئے بلکہ ہمیں تو ہر اُس شئے پر تھوک دینا ہوگا جس سے بورژوا ذہنیت کو فروغ ملے۔ ہاں البتہ ہمیں پرولتاری نیشنلزم کو سینے سے لگانا ہوگا، ہمیں عوامی حقوق کے لئے جدوجہد کرنا ہوگی، ہمیں عوام کے کلچر، عوام کی تہذیب، عوام کی زبان کی حفاظت کرنی ہوگی، ہمیں سبھی صوبوں کے عوام کی خواہشات کا احترام کرنا ہوگا، اور ہمیں ہر خطے کے عوام کو مظلوم سمجھنا ہوگا بلکہ ہمیں ہر صوبہ کے عوام کو سندھ کا عوام سمجھنا ہوگا ـــ اور ـــ اور ہمیں اس بورژوا ذہن کو چاہے وہ کسی صوبے سے تعلق رکھے، کچلنا ہوگا، بالکل اس طرح جیسے سانپ کو مارنے کے بعد اس کا پھن کچل دیا جاتا ہے..... دوستو! اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ دُنیا کا سب سے بڑا گناہ کونسا ہے؟ تو آپ یقین کیجیے، میرا جواب ہوگا " عوام میں عوام کے خلاف تعصب اور نفرت پھیلانا ـــ!" میری نظر میں کسی انسان کا اس سے بڑا اور گھناؤنا کوئی جرم نہیں ـــ!

اُس نے والہانہ انداز میں اس نوجوان کے سراپے کا جائزہ لیا، جس کی بڑی بڑی روشن آنکھوں میں محبت، سچائی اور انسان دوستی کی جھلک صاف دکھائی دی۔ اس شخص کی سوچ کتنی سیدھی سادی اور کتنی سچی ہے۔ تب اُس نے دیکھا وہ نوجوان سب ساتھیوں کے ساتھ واپس جا رہا تھا ـ اس کا دل بے اختیار چاہا کہ وہ اس نوجوان کو روک کر کہے ـــ اے اجنبی دوست کہاں جا رہے ہو تم بولتے کیوں نہیں، تم رُک کیوں گئے، ابھی تو تمہیں بہت کچھ بتلانا ہوگا ـــ ابھی تو تمہیں بہت کچھ سمجھانا ہوگا ـــ کچھ تو بولو، میرے لئے نہیں، تو اس آنے والی نئی نسل کے لئے جو کل کی عظیم پرولتاریہ ہوگی ـــ تاکہ وہ مہاجر، پنجابی، پٹھان، متحدہ محاذ نہ بنائے تاکہ وہ بورژوا طبقے کے مفاد کی خاطر بورژوا نیشنلزم کی پرچار نہ کرے۔ تاکہ وہ عوام میں عوام کے خلاف نفرت کا زہر نہ گھولے...... اور دُنیا کا سب سے بڑا گھناؤنا جرم سرانجام نہ دے...... رُک جاؤ...... رُک جاؤ.....

ویرانِ دل کی کہانی



جنوبی افریقہ کا مختصر افسانہ

الیکس لاگوما

ترجمہ :۔ نعیم آروی

جب تم سیڑھیوں سے اتر کر نیچے پہنچے تو پوری سڑک دھوپ میں لپٹی ہوئی چمک رہی تھی، تمہاری پہلی نظر جس شخص پر پڑی وہ ٹوپیکا اور برجس پہنے ہوئے انتہائی عجلت میں تمہارے سامنے سے گذر رہا سڑک پر بے شمار لوگ چل رہے تھے۔ لیکن تم کسی کی جانب نہیں دیکھ رہے تھے وہ تمہاری نظریں اتفاقیہ اس شخص پر پڑ گئی تھیں در اصل اس ہجوم میں تمہاری نگاہیں کسی اور کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ اچانک تمہاری متلاشی نگاہوں نے اسے ڈھونڈ ہی لیا جس کے لئے تمہاری روح بے قرار تھی۔ خوشی سے تمہارا دل اچھلنے لگا۔ اس سے ملنے کے بعد تم اس شہر میں اجنبی نہ رہتے تھے۔ تم شہر کا ایک حصہ بن جاتے تھے۔ تم تنہائی سے نفرت کرتے تھے اور اب جب کہ دوسری بار تمہاری نگاہوں نے بالآخر اسے ڈھونڈ لیا تو تم بھی تاشقند کی شاہراہوں کا ایک دھڑکتا ہوا حصہ بن چکے تھے۔ درختوں کی طویل قطاروں کے درمیان سے گذرتی ہوئی وہ فوارے کے قریب پہنچ گئی تھی تم نے بڑی آہستگی سے کہا۔ ہیلو، دیوکا۔"

"ہیری"۔ تم"

"بھئی میں کہیں دوسری جگہ جانا پسند نہ کروں گی"۔

"نہیں"

"میں یہاں مزے میں ہوں"۔

تم بالائی منزل کے کمرے میں خاموشی اور یکسوئی سے اپنے کپڑے تہہ کر کے سوٹ کیس میں رکھ رہے تھے۔ تمہارے قدموں کی نقل و حرکت سوکھے ہوئے پتے کی طرح تھی۔ کپڑوں کی پیکنگ کے دوران تمہارے ذہن میں گذرے ہوئے لمحات کی یاد تازہ ہو رہی تھی، تم دونوں نے اکٹھے سڑک کے کنارے ایک ہوٹل میں کھانا کھایا اور پھر وہاں سے نکل کر ایک دوسرے ہوٹل میں گھس گئے جہاں تم دونوں نے چٹ پٹے مسالے والے گوشت سے لطف اٹھایا۔ گوشت کھاتے ہوئے اس کے ہونٹ اور رخساروں پر مسالے کی چکنائی پھیل گئی تھی اور تم اس پر بے تحاشہ ہنس رہے تھے۔ ایسے میں ایک چھوٹا سا لڑکا، جس کے سر پر ریشمی رومال بندھا ہوا تھا، تمہیں بڑی دلچسپی اور حیرت سے دیکھ رہا تھا ہوٹل کے دریچے سے اس قدیم عمارت کی بڑی بڑی دیواریں صاف نظر آ رہی تھیں جو زلزلہ کی وجہ سے درمیان سے شق ہو گئی تھیں اس سے پرے فلیٹوں کے بڑے بڑے بلاک تعمیر ہو رہے تھے اور اس کے اوپر ایک عظیم الجثہ کرین آسمان کی نیلگوں وسعتوں کے درمیان تنا کھڑا تھا پس منظر میں سفید بادلوں کے چنچل ٹکڑے تیر رہے تھے۔ ہوٹل کی فضا مرغن غذا کی چٹ پٹی خوشبو سے بوجھل تھی آتشدان میں خوب تیز آگ بھڑک رہی تھی اس کے تیلے تیلے بل کھاتے ہوئے شعلے باہر لپک رہے تھے۔ اس نے بڑی ملائمت سے پوچھا تھا کیا تمہیں لطف آ رہا ہے؟

تم دونوں اکٹھے تاشقند سے دور یانگی پل میں ہم آغل کی سڑکوں سے گذرے، سڑک کے دونوں کنارے دور تک سبز اور بھورے رنگ کے کھیت پھیلے ہوئے تھے، فصل تیار کھڑی تھی، دیہاتی لڑکیاں خوشی سے رقص کر رہی تھیں اور ان کے لباس اور سیاہ بال دھوپ میں چمک رہے تھے، تم ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر کاؤنٹر پر بیٹھ گئے اور سفید بالوں والے بڈھوں کے ساتھ سبز چائے کی ہلکی ہلکی چسکیاں لیتے رہے جھریوں سے بھرا ہوا ان کا چہرہ کس قدر تر و تازہ تھا، اور ان کی آنکھوں میں کتنی روشنی پھوٹ رہی تھی، وہ جب ہنستے تھے تو ان کی پگڑی اور پگڑی کے نیچے بھورے رنگ کی داڑھی بھی ہلنے لگتی تھی،

آخر کچھ لوگ صرف خدا حافظ کہنے کے لئے کیوں بنائے جاتے ہیں؟

اور اب تم اسے خدا حافظ کہنے کی تیاری کر رہے تھے تم اسے اسٹیشن پر خدا حافظ کہنے جا رہے تھے تم اسے لندن اوسلو، دارالسلام اور لینن گراڈ میں بھی خدا حافظ کہہ چکے تھے اور اس دہرائے ہوئے عمل کو ایک بار پھر تم دہرانے جا رہے تھے۔ لہٰذا تم اندر سے بہت دکھی تھے تم نے اپنا سگریٹ سلگایا۔ راکھ کے اندر چمکتی ہوئی چنگاری میں تمہیں اس کا مسکراتا ہوا چہرہ اور اس کے سیاہ بال لہراتے ہوئے نظر آئے۔

”آخر کچھ لوگ صرف خدا حافظ کہنے کے لئے کیوں بنائے جاتے ہیں“۔ تم نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

”شائد اس لئے کہ دوبارہ ملاقات پر ہیلو کہہ سکیں“۔

”کیا ہم ایک بار پھر ملیں گے“۔

”کچھ نہیں کہہ سکتی، ہیری دنیا بہت بڑی ہے“۔

”میں تمہارے ساتھ رکنا چاہتا ہوں ہمیشہ کی طرح اس بار تمہیں خدا حافظ کہنا نہیں چاہتا“۔

”کیا تمہیں اس پر پورا یقین ہے، ہیری“۔

میں کس چیز پر یقین رکھتا ہوں، اس سے لاعلم ہوں مگر اس بات پر یقین ہے کہ اس بار ہمیشہ کی طرح نہ ہوگا“۔

اس دن اس نے ہمیشہ کی طرح ازبک لباس نہیں پہنا تھا بلکہ ڈھیلی ڈھالی آستینوں والا سرخ رنگ کا چغہ پہن رکھا تھا۔ سرخ رنگ محبت کا رنگ اس کی آنکھوں میں اپنائیت کی آگ دھائیں دھائیں جل رہی تھی۔

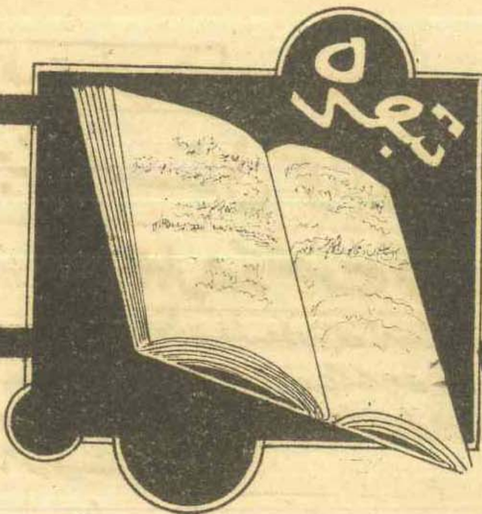
”اس نے کہا تھا“ مجھے دفتر میں کچھ کام ہے، مگر میں تمہیں اسٹیشن پر خدا حافظ کہنے ضرور آؤں گی“ تم نے کہا تھا۔ اور کہے مگر تم ٹھیک وقت پہ پہنچ جانا“۔

”میں ضرور آؤں گی، ہیری، فکر مت کرو“۔

کہیں ایسا نہ ہو کہ سمرقند کی طرح تم یہاں بھی راستہ بھول جاؤ“۔ اس روز سمرقند میں عام تعطیل تھی۔ علی شیر نوائی کی تقریبات کے سلسلے میں ساری سڑکیں، کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں، سڑکوں اور گلیوں میں روسی اور ازبک باشندے گلے میں بانہیں ڈالے گھوم رہے تھے۔ سڑکوں کے دو رویہ پھل، تربوز اور کھانے پینے کی دکانیں کھلی ہوئی ہیں۔ مارکیٹ اور رجستان اسکوائر پر زبردست بھیڑ تھی، ہر طرف بلند و بالا، نفیس عمارتیں، رنگین جالیاں نقش و نگار، گنبد اور مینار کھڑے تھے یہ صدیوں پر محیط قدیم یادگاریں تھیں یہ تیمور کا دارالسلطنت تھا، تیمور لنگ ظالم تیمور، فاتح تیمور، رخساروں کی ابھری ہوئی ہڈیاں، شقاوت اور صلابت میں ڈوبی ہوئی چمکدار آنکھیں شانوں سے ڈھلکے ہوئے تیر کمان سفید فر کی لمبی لمبی ٹوپیاں بڑے بڑے بوٹ آسمان کی جانب نیزہ بلند کئے ہوئے آندھی اور طوفان کی طرح نمودار ہونے والی تیمور کی فوج وسطی ایشیا کے مغل فاتح نڈر، خونخوار، طبل جنگ پر چوٹ پڑتی ہے سنکھ کی آواز گونجنے لگتی ہے اور کوئی نیا شہر آگ کے شعلوں میں جلنے لگتا ہے

مگر اس روز سمرقند کی سڑکوں پر تیمور اور اس کی فوج نہ تھی، پورا شہر خوشیوں اور قہقہوں کے سمندر میں تیر رہا تھا گاڑیاں، کھڑکھڑاتی ہوئی تیزی سے گذر رہی تھیں، گھڑسوار جی کھول کر ٹھٹھے لگا رہے تھے اور تم سب کو خدا حافظ کہنے والے تھے۔ ریلوے اسٹیشن پر تمہارا سامان بوگی میں رکھ دیا گیا تم گاڑی کے باہر کھڑے ہوئے کسی کا انتظار کر رہے تھے۔ اسٹیشن پر معمول کی ہلچل مچی ہوئی تھی لوگ ایک دوسرے سے گلے مل رہے تھے۔ کچھ لوگ ہنس رہے تھے۔ اور کچھ لوگ رو رہے تھے مگر تم بڑی خاموشی سے پورے پلیٹ فارم پر اسے ڈھونڈ رہے تھے۔ مگر وہ نہ ملی بالآخر ایک تیز اور دل میں اتر جانے والی سیٹی کے ساتھ گاڑی پلیٹ فارم پر سے رینگنے لگی، تم نے مایوسی سے آخری بار ریلوے اسٹیشن پر نظر دوڑائی، سینکڑوں ہاتھ ہل رہے، سینکڑوں رنگین رومال فضا میں لہرا رہے تھے، مگر تمہیں وہ کہیں نظر نہ آئی، تمہیں بعد میں معلوم ہو کہ اسے دفتر سے چھٹی نہ مل سکی تھی اور وہ تم سے ریلوے اسٹیشن پہ ملنے نہ آ سکی۔

وہ اس بار بھی تمہیں خدا حافظ کہنے اسٹیشن پر نہ آ سکی، تنہائی نے ایک بار پھر تمہیں چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ کنڈکٹر دروازے پر بہت دیر تک کھڑا کھڑا تمہارا انتظار کرتا رہا۔ مارے دکھ کے تمہارا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ تمہیں دور سے بھاگتی ہوئی ایک لڑکی نظر آئی۔ اچانک تمہارا دل خوشی سے ناچنے لگا۔ تم بے اختیار پکار اٹھے ”دیوکا“ مگر وہ دیوکا نہ تھی کوئی اور تھی تم بھاری دل کے ساتھ گاڑی پر چڑھ گئے۔ کنڈکٹر نے دروازہ بند کر دیا۔ تم کاریڈور میں کھڑے ہو گئے اور کھڑکی سے سر نکال کر باہر دیکھا۔ پلیٹ فارم تمہارے دل کی طرح تنہا اور خالی نظر آیا۔ گاڑی کے وزنی پہئیے کی کھٹا کھٹ سیدھے تمہارے دل پہ لگ رہی تھی، تم نے آخری بار حسرت بھری نظروں سے اوجھل ہوتے ہوئے پلیٹ فارم کو دیکھا۔ وہاں کچھ بھی تو نہ تھا۔ تم نے سر اندر کر لیا۔ اور ہچکولے کھاتی ہوئی دیوار سے لگ کر کھڑے ہو گئے اور تیزی سے بھاگتی ہوئی گاڑی کی آواز کو تم نے اپنے دل میں جذب کر لیا۔ دوبارہ واپس آنا، دوبارہ واپس آنا— دوبارہ واپس آنا—



"منافقت اس قدر تھی اور ہے میں اس سارے کھیل سے کئی بار بیزار ہوا"

لمحے کی بات (افسانے)

از - منیر احمد شیخ
طابع - اظہار سنز ۵/۱۲۰ ٹمپل روڈ - لاہور
صفحات - ۲۱۳
قیمت - ۱۲ روپے

منیر احمد شیخ، اپنے انشائیوں اور افسانوں کے حوالے سے ادبی حلقوں میں خاصے معروف ہیں - پیش لفظ سے، جسے انہوں نے "سیاہ حروف کا فسانہ" کہا ہے - یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے -

میں نے اپنے اردگرد دیکھا کہ لوگ ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی فکر میں پاگل ہوئے جاتے ہیں - ہر شعبے میں نیچے سے اوپر تک مسابقت کا کمینہ جذبہ ہر جگہ نظر آیا - اپنی اپنی بساط کے مطابق چالاکیاں اور فریب، جھوٹ اور تصنع، تملّق اور منافقت اور حد درجے کی منافقت اس قدر تھی اور ہے کہ میں اس سارے کھیل سے کئی بار بیزار ہوا، اس بیزاری میں ایک شخص نے ہمیشہ کہا کہ اس بکواس میں معنی پیدا کرو اور یہ معنی خود بخود اس طرح پیدا ہوں گے کہ تم جو کچھ دیکھتے اور سہتے ہو - اسے لکھ دیا کرو -"

اس عبارت سے، اُس محرک جذبے کی نشاندہی ہوتی ہے جو مظفر علی سیّد کے مشورے سے افسانوں کے قالب میں ڈھلتا رہا ہے اور اندازہ یہ ہوتا ہے کہ مشورہ کچھ غلط نہ تھا ویسے تو ہر لمحہ ایک کہانی اور ہر انسان، سلسلہ در سلسلہ ایک داستان ہے، لیکن اپنے وجود میں چھپی ہوئی ان کہانیوں اور داستانوں کی گتھیاں سلجھا کر انہیں مربوط پیرائے میں دوسروں تک پہنچانا ہر ایک کے بس کی بات نہیں - پھر اگر کوئی حسّاس نوجوان ایک لمحے کی بات یاد رکھتا ہے اور ان کے ربط سے کہانی بنا سکتا ہے - ایسی کہانی جو ہمیں اپنے ماحول سے روشناس کرا دیتی ہے اور معاشرے کے علاوہ کرداروں کے تضادات کی بھی تصویر پیش کرتی ہے تو وہ اسے یہ تخلیقی ہنر ضرور اختیار کرنا چاہیے - ویسے تخلیقی عمل کا معاملہ یہ ہے کہ اظہار کا مشورہ کوئی دے یا نہ دے عشق اور مُشک کی طرح یہ بھی نہیں چھپتا -

یہ بیشتر کہانیاں ایسے کرداروں کا احاطہ کرتی ہیں - جو ہمارے جدید معاشرے نے پیدا کئے ہیں - اس معاشرے میں تعلیم ہے، روشن خیالی ہے، نظم اور ترتیب ہے - لیکن یہ سب کچھ اوپر اوپر کی بات ہے، اندر سے اس میں زبردست انتشار ہے - منافقت ہے، بے حسی اور خود غرضی ہے - اس معاشرے کے کردار تعقّل پسندی، آزاد خیالی اور حقیقت پسندی کی باتیں کرتے ہیں، لیکن یہ سب ریاکار ہوتے ہیں - "لمحے کی بات" میں فلسفی لڑکی ویسے تو یہ دعویٰ کرتی ہے کہ درحقیقت وہی لمحہ ہے جو آپ کے سامنے ہے، لیکن وہ خود بے معنی رومان پرستی کا شکار ہو جاتی ہے اور اس ان پڑھ عورت سے مات کھا جاتی ہے، جو فراہ آواز دے کر اس کے آئیڈیل کو، ہمراہ تانگے میں بٹھا کر ڈھٹائی کے ساتھ اڑا لے جاتی ہے -

"میں تو اس بات سے خوش ہوں کہ صابن والی نے سارتر کو نہیں پڑھا"

"اگر پڑھ لیتی؟" اس نے لرزتے ہوئے ہونٹوں سے پوچھا
تو وہ لمحے کو زندہ حقیقت نہ بنا سکتی -

اسی نوعیت کا دوسرا افسانہ دن اصغر مال ہے، جس کے مکین ویسے تو پرانے شہر کی بوسیدہ دیواروں کے درمیان پلے بڑھے ہیں - لیکن اب وہ اس کے تعلق سے شرماتے ہیں اور اپنا رشتہ شہر کے اس جدید علاقے سے جوڑتے ہیں جس کی تعمیر امریکی معاشرے کی بنیادوں پر ہوئی ہے - یہاں کے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں امریکی یونیورسٹیوں سے ڈگریاں لے کر آتے ہیں اور سخت کالر والی قمیض میں گردن اکڑا کر چلتے ہیں - انہیں گردو پیش نگاہ کرتے ہوئے بھی کوفت ہوتی ہے - لیکن انہی میں سے ایک نوجوان جب طوائف کے کوٹھے پر چھپ کر جاتا ہے اور سری پائے کا دوکاندار پہلوان پیچھا کرتے کرتے اسے جا لیتا ہے تو اسے اعتراض نوجوان کے یہاں آنے پر نہیں ہوتا، البتہ چھپ کر آنے پر ہوتا ہے -

"باؤ! یہاں آنا کوئی بری بات نہیں پر مرد کی اولاد ہو تو سیدھے دروازے سے آیا کرو -"

منیر شیخ معاشرے کے قدیم رنگ کو جدید سے بدرجہا بہتر سمجھتے ہیں، پہلے انسانوں کو ان کے ہنر سے پہچانا جاتا تھا، اب حکمرانہ درجہ بندی نے مکانوں کی طرح انسانوں کی بھی تقسیم کر دی ہے - مکانوں کی طرح انسان بھی اے کلاس اور ڈی کلاس کے درمیان بٹے ہوئے ملتے ہیں - یہ ایک سے مکانوں کی سیدھی قطاریں، یہ پیٹرول والی گاڑیوں کا بے ہنگم سلسلہ اور ان کا شور سڑکوں کی چکا چوندھ روشنی، یہ انسانوں کے بظاہر سیدھے سپاٹ چہرے، لیکن دکھی ستم زدہ، منافق اور فریبی روحیں، یہ سب کیا ہے اور کیوں ہے؟ منیر شیخ کے افسانے حال کے اس کرب کا خوبصورتی سے احاطہ کرتے ہیں - البتہ انھیں یہ احتیاط کرنی ہوگی کہ ان کے افسانے محض ماضی مرحوم کا نوحہ بن کے نہ رہ جائیں -

افسانے دبیز کاغذ پر خوبصورت ٹائپ میں سلیقے سے شائع کئے گئے ہیں -

قرآن کی روشنی میں (دینیات)

از - شیخ عبدالحق ایم اے
اسلامی مشن - نسبت نگر، لاہور

ادھر کچھ عرصے سے دینی کتابچے اور مساجد کے خطبے بھی "عالموں" اور پیش اماموں کی "سیاست" سے محفوظ نہیں رہے اختلاف سیاست کے استعمال پر نہیں، کیونکہ سیاسی علم، زندگی کے ہر شعبے میں ضروری ہے، لیکن ان حضرات کی سیاست کا مفہوم کچھ اور ہوتا ہے، ان کا مدعا عام طور سے استحصالی طبقوں کی وکالت ہوتا ہے، کیونکہ خود یہ لوگ اپنا رزق انہیں طبقوں کے مفاد سے وابستہ رکھتے ہیں - ایسے میں اگر کوئی کتابچہ اصلاح کردار کے مخلصانہ جذبے کے تحت لکھا جائے تو اسے دیکھ کر خوشی ہوتی ہے - زیر نظر کتابچہ عام قارئین کے لئے بالعموم اور اساتذہ کے لئے بطور خاص لکھا گیا ہے، اس کے مصنّف سنٹرل ٹریننگ کالج اور گورنمنٹ کالج لاہور کے پروفیسر رہ چکے ہیں انہوں نے قرآنی آیات کی مدد سے زندگی کے روزمرہ آداب متعیّن کئے ہیں اور عام لوگوں کو وہ باتیں بتائی ہیں جو مجلسی اور کاروباری میل و جول میں اُن کے پیش نظر اکثر نہیں ہوتیں مصنّف نے محض شرع کی پابندی کو کردار کا لازمہ قرار نہیں دیا ہے - بلکہ مجلسی زندگی میں کردار کی اہمیت متعیّن کی ہے -

کتابچہ سفید کاغذ پر آفسٹ میں چھاپا گیا ہے -

ظہیر اختر بیدری

ہندوستانی عوام یا فرقہ پرست سرمایہ دار؟

ہمارے دشمن کون ہیں؟

ہندوستانی حکومتی طیارے کی تباہی کے مسئلہ کو اپنی انتخابی مہم میں کامیابی سے استعمال کر رہی ہے۔ ہندوستان کی ترقی پسند طاقتوں کا فرض ہے کہ وہ رجعت پسندوں کی ان سازشوں کو عوام پر بے نقاب کریں۔ اسی طرح پاکستان کے ترقی پسند عناصر کا یہ کام ہے کہ پاکستان کی رجعتی طاقتوں کو پاکستانی عوام میں محض ہندو دشمنی کی فضا نہ پیدا کرنے دیں۔!

تقسیم ملک کے بعد جس طرح پاکستان میں جاگیر داروں کے ہاتھوں میں اقتدار آگیا۔ اسی طرح ہندوستان میں اقتدار سرمایہ دار طبقہ کے قبضے میں چلا گیا۔ دونوں ملکوں کے ان عوام دشمن برسر اقتدار طبقوں کے مفادات کا تقاضہ یہ تھا اور اب بھی ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے عوام میں مذہبی منافرت کے جذبات بھڑکا کر انکی توجہ اصل دشمنوں کی طرف سے ہٹا دیں۔ برصغیر کی تقسیم یوں تو، نو آبادیاتی نظام کے خاتمہ ہی کی ایک کڑی ہے لیکن انگریز اور برصغیر کے جاگیر داروں اور سرمایہ داروں کے مفادات کا یہ تقاضہ تھا کہ برصغیر سے نو آبادیاتی نظام کا خاتمہ (جو ناگزیر تھا) اس طرح ہو کہ دونوں ملکوں کے پسماندہ اور مفلوک الحال عوام ہمیشہ ایکدوسرے سے نفرت کرتے رہیں۔

تقسیم سے قبل اور تقسیم کے بعد ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت فرقہ دارانہ فسادات کرائے گئے حتی کہ ۱۹۶۵ء کی پاک و ہند جنگ کو بھی دونوں ملکوں کی رجعت پسند سیاسی جماعتوں نے بھرپور طریقے سے قومی اور مذہبی منافرت بڑھانے کے لئے استعمال کیا۔ کشمیر اور فرخا بند جیسے مسائل کو حل نہ کرنے کی بھی ایک بنیادی وجہ یہی ہے کہ دونوں ملکوں کے برسر اقتدار عوام دشمن طبقے اور امریکی سامراج ان مسائل کو باقی رکھ کر دونوں ملکوں کے عوام کو ایک دوسرے کے خلاف صف آرا رکھنا چاہتے ہیں۔

ہندوستان میں رجعت پرستوں کا کردار

پنڈت نہرو کی حکومت جو ہندوستان کے اجارہ دار سرمایہ دار طبقہ کی نمائندہ تھی اپنے بے سروپا سوشلسٹ پروگرام اور غیر جانبداری کی آڑ میں ۱۵-۱۶ سال تک ہندوستانی عوام اور ساری دنیا کو فریب دیتی رہی ہے۔ ایک طرف ہندی، چینی بھائی بھائی کے نعرے لگتے رہے اور دوسری طرف امریکی سامراج سے درپردہ تعلقات استوار ہوتے رہے۔ ان دونوں بلاکوں سے حاصل کی جانے والی امداد سے بہرا، ٹاٹا فائدہ اٹھاتے رہے۔ لیکن سوشلسٹ ملکوں سے تعلقات کے نتیجے میں جب ہندوستان کے مفلوک الحال عوام میں سوشلزم سے دلچسپی خطرے کی حد تک بڑھنے لگی تو حکمران طبقے نے ہندوستان کے اجارہ دار طبقے اور امریکی سامراج کے اشارے پر چین کے خلاف سرحدی جنگ چھیڑ کر ہندوستانی عوام کی سوشلزم اور پڑوسی ملک چین سے بڑھتی ہوئی دوستی کو دشمنی میں تبدیل کرنا پڑا اور اس کے ساتھ ہی امریکہ سے فوجی امداد حاصل کرنے کی راہیں بھی کھول لی گئیں۔ جن سنگھ اور ہندو مہاسبھا جیسی کٹر رجعت پسند جماعتوں نے اس موقع سے منصوبے کے مطابق فائدہ اٹھاتے ہوئے ——— ہندوستانی عوام میں چین کے خلاف نفرت پھیلانے کی کوششیں کیں۔

یہ صحیح ہے کہ برصغیر کی تقسیم دو قومی نظریے کی بنیاد پر ہوئی تھی۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس تقسیم کو دو طبقوں کے مفادات کے لئے استعمال کیا گیا۔ اور وہ تھے دونوں ملکوں کے استحصالی طبقے جاگیر دار اور سرمایہ دار۔ ہندوستانی عوام کو رام راجیہ کی برکتوں کا خواب دکھایا گیا۔ اور پاکستانی عوام کو حکومت الٰہیہ کے قیام کی نوید دی گئی۔ لیکن ۲۳ سال گذر جانے کے باوجود نہ ہندی عوام رام راجیہ کی برکتوں سے روشناس ہو سکے نہ پاکستانی عوام کو حکومت الٰہیہ کی نعمتوں سے استفادے کا موقع ملا۔!

جن سنگھ اور مہاسبھا

سامراجی طاقتیں اور ان کے مقامی ایجنٹ سادہ دل عوام کی قدامت پرستی اور ذہنی پسماندگی سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور اٹھاتے رہیں گے۔ اگر ہندوستان کی جن سنگھ، مہاسبھا، راشٹریہ سیوک سنگھ اور پاکستان کی جماعت اسلامی، مرکزی جمعیت العلمائے اسلام، پی ڈی پی وغیرہ پاکستانی عوام میں ہندوؤں کے خلاف اور ہندی عوام میں مسلمانوں کے خلاف نفرت کے جذبات ابھارتی رہتی ہیں تو وہ اس فعل کو اپنی بقا کے لئے ضروری سمجھتی ہیں لیکن ہندوستان یا پاکستان کی بائیں بازو کی طاقتیں جب "پاکستان ہمارا دشمن ہے" یا "بھارت ہمارا دشمن ہے" کہتی ہیں تو ان نعروں سے بھی مذہبی منافرت اور تنگ دلانہ قوم پرستی کی حمایت کا پہلو نکل آتا ہے۔

رجعت پرستوں کی سازشوں کو ناکام کرنے کیلئے دونوں ملکوں کے ترقی پسند عوام میدان میں کیوں نہیں آسکتے

حالانکہ بائیں بازو سے متعلق سیاسی جماعتوں میں سائنٹفک سوشلزم کی علمبردار جماعتیں صرف ملکی و غیر ملکی استحصالی طبقوں کی مخالف اور ہر ملک کے مظلوم عوام کی پوری طرح حامی ہوتی ہیں۔ ایسی مخلوط طبقاتی سیاسی جماعتیں بھی جو ترقی پذیر ملکوں میں قوم پرستانہ اور سامراج دشمن کردار کی حامل ہوتی ہیں کسی ملک سے اپنی دوستی اور دشمنی کی بنیاد اس کے سامراج دشمن اور سامراج دوست کردار کو بناتی ہیں۔ یہ جماعتیں بھی ہر ملک کے مظلوم عوام کی حامی ہوتی ہیں اور دائیں بازو کی رجعت پسند جماعتوں کی طرح کسی ملک سے اپنی دوستی اور دشمنی کو مذہبی اختلاف کی ترازو میں نہیں تولیں۔ ہند و پاکستان کے عوام کا سیاسی شعور جس سطح پر ہے اور تقسیم ہند میں مذہبی منافرت کے جو عوامل کارفرما رہے ہیں اس کے پیش نظر یہ اور زیادہ ضروری ہے کہ بائیں بازو کی جماعتیں ہندوستان کے متعلق بات کرتے وقت، اس کی صراحت کر دیں کہ ان کا روئے سخن حکمران طبقے کی طرف ہے، نہ کہ ہندوستانی عوام کی طرف۔

پاکستان میں فسادات کا ردِ عمل

پاکستانی عوام کے لئے مسئلہ کشمیر کی نوعیت خواہ کچھ بھی ہو لیکن ان کے لئے یہ ایک جذباتی مسئلہ بھی ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم کشمیر کے چالیس لاکھ مظلوم عوام کے مسلمہ حق خود اداری کی حمایت سے دست بردار ہو جائیں بلکہ ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ جب ہم ہندوستان کو اپنا دشمن کہیں تو ساتھ ہی اس بات کی وضاحت کر دیں کہ اس سے ہماری مراد ہندوستان کے برسر اقتدار سرمایہ دار، اجارہ دار طبقہ کی دشمنی ہے۔ وہاں کے پچاس کروڑ محنت کش عوام جو پاکستانی عوام کی طرح ۲۳ سال سے استحصالی قوتوں کے شکنجے میں پھنسے ہوئے ہیں، بلا امتیاز مذہب و ملت ہمارے دوست ہیں۔ ہندوستان کا برسر اقتدار عوام دشمن طبقہ لاکھوں روپوں سے شیو سینا اور جن سنگھ جیسی فرقہ پرست تنظیموں کی سرپرستی کرتا ہے۔ اور آئے دن فرقہ وارانہ فسادات کرواتا رہتا ہے۔ جس کا مقصد ہندوستانی عوام کی توجہ کو مسائل کی طرف سے ہٹانا، محنت کشوں کے بین الاقوامی طبقاتی رشتوں کو کمزور کر کے مذہبی جنون پھیلانا اور اس طرح استحصال کے لئے اپنا راستہ صاف کرنا ہوتا ہے۔ جب بھی ہندوستان میں کوئی فرقہ وارانہ فساد ہوتا ہے تو پاکستانی عوام میں اس کا ردِ عمل فطری طور پر ہوتا ہے لیکن رنج و اندوہ کے فطری جذبات سے قطع نظر پاکستان کی رجعت پسند جماعتیں اور اخبارات فسادات کی خبروں کو اسطرح پیش کرتے ہیں کہ فسادات کے اصل ذمہ دار نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں اور مسلمانوں میں ہندوؤں کے خلاف نفرت بڑھ جاتی ہے۔ فرقہ وارانہ فسادات قتل و غارت گری میں ہندوستان کے

بھٹو کے خلاف عوام دشمن اخبارات کی ایک سازش

مکتوب ملتان :۔ روشن ضمیر

ایک فرضی خبر کی سچی کہانی

ملتان میں بھٹو کا مفروضہ بیان اخبار کے دفتر میں تیار کیا گیا تھا

ملتان اپنے قافیے کی رعایت سے اصفہان کی طرح نصف جہاں تو نہیں بن سکا، البتہ شیطان کا قافیہ اس کے ساتھ ضرور نتھی ہو گیا ہے۔ ایوب خاں کے حکومت سنبھالنے کے بعد ان کے اعزاز میں سب سے پہلا اور سب سے بڑا جلسہ کرنے کا شرف اسی ملتان کو حاصل ہوا۔ (اس وقت جناب مختار مسعود ڈپٹی کمشنر تھے) پھر جب ایوب خاں کے خلاف عوامی نفرت کا طوفان اٹھا اور مسٹر بھٹو اس نفرت اور غصہ کی علامت بن کر ابھرے تو ان کے خلاف سب سے پہلا ہنگامہ بھی ملتان میں ہوا۔ (جلسہ عام میں ایک سرکاری غنڈہ چھری لہراتا ہوا کھڑا ہوا، اور نوجوانوں نے کرسیاں مار مار کر اسے بے ہوش کر دیا۔ جو سرکاری افسر اس ہنگامہ کی نگرانی کر رہے تھے، اپنے آدمی کو پٹتا دیکھ کر فرار ہو گئے) شیزان ہوٹل کے شیشے توڑے گئے اور لاہور جانے والی سڑک پر مسٹر بھٹو کی کار پر پتھراؤ کیا گیا۔ اسی ملتان ڈویژن شہر منٹگمری (اب ساہیوال) میں ٹرین کے اندر گھس کر مولانا بھاشانی پر حملہ کیا گیا اور پھر وہ دن بھی آیا کہ اسی شہر کے ہوائی اڈہ پر مسٹر بھٹو کا استقبال کرنے والوں نے جوش میں آ کر رن وے کے قریب لوہے کا جنگلہ توڑ دیا۔ اور اب گذشتہ ہفتہ اسی شہر کے چند اخباری نمائندوں نے ایک سازش کے تحت بھٹو صاحب کے نام سے ایک ایسا بیان منسوب کر کے اخبارات کو بھیج دیا۔ جس سے نہ صرف مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کے درمیان اختلافات کی خلیج وسیع ہو جائے بلکہ مارشل لا حکومت کے ساتھ پیپلز پارٹی کی لڑائی بھی ہو جائے سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان عقل کے اندھے اخباری نمائندوں نے یہ خیال نہیں کیا کہ یہ بیان پیپلز پارٹی کی واضح اور علانیہ پالیسی کے بالکل خلاف ہے۔

بیان تو آپ شاید پڑھ چکے ہوں گے کہ "اگر مجیب نے چھ نکات پر آئین بنایا تو مسٹر بھٹو اس کے خلاف تحریک چلائیں گے" مسٹر بھٹو کی تردید بھی آپ نے پڑھ لی ہو گی۔ تاہم یہ معلوم کرنے کے لئے آپ ضرور بے چین ہوں گے۔ کہ یہ خبر کیسے گھڑ بنی؟ تو روزنامہ امروز ملتان کی ۱۲۔ فروری ۷۱ء کی اشاعت میں چھپنے والی یہ خبر آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔

(امروز کے سٹاف رپورٹر سے)

سرمایہ دار براہ راست حصہ نہیں لیتے بلکہ غریب عوام ہی ایک دوسرے کا گلا گھونٹتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر غنڈوں اور مذہبی جنونیوں کو صرف استعمال کیا جاتا ہے۔ ورنہ جس طرح پاکستانی مسلمانوں کی اکثریت فرقہ دارانہ جنون سے نفرت کرتی ہے اسی طرح کے کروڑوں ہندوستانی محنت کش فرقہ دارانہ درندگی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔!

امریکی سامراج آج دنیا کے عوام خصوصاً چینی عوام کا سب سے بڑا دشمن ہے لیکن چین کے عظیم رہنما جب امریکی سامراج کی مذمت کرتے ہیں تو واضح طور پر یہ کہتے ہیں کہ امریکہ اور ساری دنیا کے عوام ہمارے دوست ہیں۔ ہندوستان کی سامراج نوازی اور چین دشمنی کی مذمت کرتے ہوئے چینی رہنما ہندوستانی عوام کو نہ صرف اپنی دوستی کا یقین دلاتے ہیں بلکہ استحصالی طبقوں اور سامراج کے خلاف ان کی جدوجہد کی مکمل حمایت کا اعلان کرتے ہیں۔ ان حقائق کی روشنی میں جب ہم پاکستان میں ہندوستان دشمنی کے نعروں کا جائزہ لیتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے گویا ہم ہندوستان کے برسر اقتدار گروہ کے خلاف نہیں بلکہ ہندو قوم کے خلاف اپنے عوام میں نفرت بڑھا رہے ہیں جو یقیناً ایک غیر ترقی پسندانہ رجحان ہے

لاہور ایئرپورٹ پر ہندوستانی طیارے کی تباہی کا جو ردِّعمل ہندوستان میں، آتش زنی اور خونریزی کی صورت میں ہوا ہے وہ ہم نے دیکھ لیا۔ ہندوستان اور پاکستان کی رجعت پسند طاقتیں موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دونوں ملکوں کے عوام کے درمیان نفرت کی خلیج کو ابھی اور وسیع کرنے کی کوشش کریں گی۔ سوال یہ ہے کہ جب دونوں ملکوں کی رجعت پسند طاقتیں اس عوام دشمن محاذ پر اکٹھی ہو سکتی ہیں تو دونوں ملکوں کے ترقی پسند عناصر رجعتی عناصر کی ان سازشوں کو بے نقاب کرنے کے لئے میدانِ عمل میں کیوں نہیں آ سکتے۔ ہندوستانی حکومت طیارے کی تباہی کے مسئلہ کو اپنی انتخابی مہم میں کامیابی سے استعمال کر رہی ہے۔ ہندوستان کی ترقی پسند طاقتوں کا فرض ہے کہ وہ رجعت پسندوں کی ان سازشوں کو عوام پر بے نقاب کریں اسی طرح پاکستان کے ترقی پسند عناصر کا کام ہے کہ وہ پاکستان کی رجعتی طاقتوں کو پاکستانی عوام میں محض ہندو دشمن کی فضا نہ پیدا کرنے دیں۔

ملتان ۱۱ فروری، پاکستان میں جمہوری حکومت کے قیام کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے اور عام انتخابات میں اکثریت سے فتح حاصل کرنے والی جماعتوں کے درمیان اختلافات پیدا کرنے کے لئے "مفاد پرست عناصر" اور شکست خوردہ جماعتوں کے کارکن کیا انداز اختیار کرتے ہیں اس کا ایک نمونہ لاہور سے شائع ہونیوالے تین اور کراچی کے ایک اخبار کی "خبر" سے لگایا جا سکتا ہے۔ جو مسٹر بھٹو کے نام سے منسوب کر کے شائع کی گئی اور جس میں مسٹر بھٹو سے ایسے الفاظ منسوب کئے گئے ہیں جس سے نہ صرف عوامی لیگ کے رہنما شیخ مجیب الرحمٰن کے دل میں بدگمانی پیدا ہو بلکہ پیپلز پارٹی اور مارشل لاء حکومت کے درمیان غلط فہمی بھی پیدا کر دی جائے یہ خبر جو کل ملتان سے خبر رساں ایجنسی پی پی آئی، ندائے ملت نوائے وقت، حریت اور جاوداں کے نمائندوں نے بھیجی تھی جس منصوبے کے ساتھ گھڑی گئی ہے وہ خود اپنی جگہ ایک خبر ہے اور یہ خبر اس طرح بنتی ہے۔ کل بدھ کے روز صبح ساڑھے دس بجے جب مسٹر صادق حسین قریشی کی قیام گاہ پر پیپلز پارٹی کا اجلاس شروع ہوا اس وقت وہاں کسی اخبار کا کوئی نمائندہ موجود نہیں تھا کیونکہ اخباری نمائندوں کو ایک شام پہلے ہی اطلاع کر دی گئی تھی، کہ یہ اجلاس خفیہ ہوگا اور بدھ کی شام کو سات بجے اس کی تفصیلات بتا دی جائیں گی اجلاس دوپہر ½ ۲ بجے تک جاری رہا تین بجے تک کھانا جاری رہا۔ جو کوٹھی کے اندر ہی تھا وقفہ کے بعد پھر اجلاس شروع ہوا جو شام سوا سات بجے تک جاری رہا اس دوران شرکائے مجلس میں سے کوئی شخص باہر نہیں آیا۔ اور نہ کسی رپورٹر سے ملاقات کی۔ کھانے کے وقفہ میں مسٹر بھٹو جب ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جا رہے تھے تو ایک شخص نے انہیں کوئی درخواست دی جسے لے کر وہ آگے بڑھ گئے۔ اس عرصہ میں انہوں نے کسی شخص سے بات نہیں کی۔ شام کو بھی مسٹر بھٹو نے کسی سے ملاقات نہیں کی۔ یہ تو وہ واقعہ ہے جو حقیقت میں پیش آیا۔ اب سنئے کہ یہ خبر کیسے بنی اور کہاں۔ اور کس وقت بنائی گئی؟۔

خبر کہاں گھڑی گئی؟

لاہور سے جو اخبارات علی الصبح ملتان پہنچتے ہیں۔ ان کے لئے دوپہر تین بجے تک خبریں پہنچ جانا ضروری ہیں ورنہ وہ شائع نہیں کر سکتے۔ چنانچہ یہ خبر ملتان میں لاہور کے ایک اخبار کے دفتر میں بیٹھ کر بنائی گئی۔ اور اسی کے ٹیلیفون سے تمام اخباروں کو یہ خبر لکھوائی گئی۔ سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ خبر دو بجے سے قبل تیار کر کے لاہور بھیج دی گئی تھی جب کہ کھانے کا وقفہ ڈھائی بجے ہوا تھا حالانکہ اس خبر کے مطابق مسٹر بھٹو نے کھانے کے وقفے میں یہ بات کہی تھی یہ خبر ایک ہی شخص نے ایک ہی دفتر میں بنائی ہے اس کا ثبوت اس بات سے مل جاتا ہے کہ چاروں اخباروں میں جو خبر شائع ہوئی ہے وہ تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ لفظ بلفظ ایک ہے۔ اس خبر کا ترجمہ پی پی آئی کی طرف سے بھیجا گیا حالانکہ پی پی آئی کا نمائندہ دن بھر نہ صرف اجلاس کے مقام کے قریب نہیں دیکھا گیا بلکہ شام کو مسٹر عبدالحفیظ پیرزادہ کی پریس کانفرنس میں بھی موجود نہیں تھا۔ سازش کے تحت اس خبر کی تیاری کا ثبوت اس بات سے بھی مل جاتا ہے کہ شام کو مسٹر پیرزادہ کی پریس کانفرنس سے پہلے لاہور کے ایک اخبار کے نمائندہ نے بڑے فخر کے ساتھ دعویٰ کیا کہ "ہم دوپہر کو ہی ایک خاص خبر بھیج چکے ہیں" پی پی آئی کے ساتھ ستم ظریفی یہ ہوئی کہ رات کو جب اخبارات کے پاس مسٹر بھٹو کا یہ فرضی بیان پہنچا تو سنجیدہ اخبارات کو اس پر یقین نہیں آیا۔ کیونکہ یہ مفروضہ بیان پیپلز پارٹی کی اعلانیہ پالیسی کے بالکل برعکس تھا۔ چنانچہ انہوں نے پی پی آئی کے ہیڈ آفس اور ریجنل آفس کو تاکید کی کہ اس کی تصدیق کر کے دیں چنانچہ پی پی آئی کے لاہور کے دفتر نے رات کو بارہ بجے کے قریب یہ خبر منسوخ کرا دی اور لاہور یا کراچی کے کسی سنجیدہ اخبار نے یہ من گھڑت اور مضحکہ خیز۔ خبر شائع نہیں کی۔ تاہم جن اخبارات یا ان کے نمائندوں کا مقصد ہی شرارت کرنا تھا۔ انہوں نے خوب نمک مرچ لگا کر بڑی بڑی سرخیوں کے ساتھ اسے شائع کر دیا اور مجبوراً مسٹر بھٹو کو آج تردید کرنا پڑی۔

یہ اخباری نمائندے کون ہیں؟

اس خبر میں اتنا ضرور اضافہ کر لیجئے کہ یہ دفتر ندائے ملت کا تھا اور خبر بھی اسی کے نمائندے نے بنا کر سب کو لکھوائی تھی یہ نمائندہ صاحب اس قسم کے کارنامے پہلے بھی انجام دے چکے ہیں۔

جہاں تک پی پی آئی کے نمائندے کا تعلق ہے اس نے اخبار نویسی محض کاروبار چلانے کے لئے شروع کر رکھی ہے، ورنہ اخبارات سے اس بے چارہ کا دور کا واسطہ بھی نہیں ہے خبریں دوسرے لوگ بنا دیتے ہیں۔ یہ صاحب ریلوے کے ٹھیکوں اور ان مربعوں پر گذارہ کرتے ہیں جو پی پی آئی کی نمائندگی نے انہیں دلائے ہیں۔ جن نمائندوں نے یہ خبر بھیجی ہے، انہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ خبر کیا ہے؟ ان کا مقصد صرف چند افراد اور جماعتوں کی خوشنودی کے لئے بائیں بازو کی جماعتوں اور لیڈروں کو بدنام کرنا اور آپس میں لڑانا ہوتا ہے۔ کون لوگ ان کو ہدایات دیتے ہیں، یہ خفیہ بات ہے البتہ ندائے ملت کے نمائندہ کے لئے اس ملک کے سب سے بڑے لیڈر اور اس کے سب سے بڑے مشیر نواب زادہ نصر اللہ خاں ہیں جن کا مکان نوائے وقت کے دفتر کے ساتھ ہے۔

بھٹو صاحب ڈھاکہ سے واپسی کے بعد اپنی پارٹی کے منتخب ارکان اور کارکنوں سے صلاح مشورہ کے لئے گذشتہ ہفتہ ملتان بھی آئے۔ منگل کی شام کو نواب صادق حسین قریشی کی کوٹھی (جسے ملتان کے لوگ وائٹ ہاؤس کہتے ہیں) پر نجی ملاقاتیں ہوئیں اور بدھ کی صبح کو دس بجے اسی کوٹھی کے لان میں جلسہ شروع ہوا اور شام کو سوا سات بجے تک جاری رہا۔ جلسہ خفیہ تھا لیکن ادھر ادھر سے جو معلومات ہم نے جمع کی ان کے مطابق صبح سے شام کے ساڑھے چھ بجے تک ملتان بہاولپور اور سرگودھا ڈویژن کے کارکن (لیڈر؟) تقریریں کرتے رہے، بھٹو صاحب نے صرف ۴۵ منٹ تقریر کی۔ بھٹو صاحب کی پارٹی کے تمام کارکنوں کو یہ خوف کھائے جا رہا تھا کہ چھ نکات آ گئے تو پاکستان کا کیا بنے گا؟ دراصل مغربی پاکستان کے دائیں بازو کے اخبارات اور لیڈروں نے ایسی فضا پیدا کر دی ہے کہ چھ نکات ہی نہیں خود مجیب الرحمان بھی "ہوّا" بن گئے ہیں۔ خود بھٹو صاحب بھی چھ نکات کے بارے میں اپنے کارکنوں کو ابھی تک "تعلیم" نہیں دے پائے ہیں۔ چنانچہ اس اجلاس میں بھی عام طور پر وہی باتیں کہی گئیں جو اب تک اخبارات کہتے رہے ہیں۔ تاہم بھٹو صاحب نے (قریبی حلقوں کی اطلاع کے مطابق) بڑی وضاحت کے ساتھ چھ نکات اور ان کے مضمرات پر روشنی ڈالی اور اپنے کارکنوں کو تسلی دی کہ چھ نکات یا بنگال سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں چھ نکات میں سب سے بڑی خامی جو نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ ان پر عملدرآمد سے مرکز کمزور ہو جائے گا جو پاکستان کی کمزوری کی دلیل ہے۔ لیکن ہم یہ حقیقت فراموش کر دیتے ہیں کہ جو جماعت ان نکات پر اصرار کر رہی ہے وہ صرف ایک صوبہ کی حکمران نہیں ہوگی، مرکز پر بھی اسی کی حکومت ہوگی۔ کیا وہ پورے پاکستان پر حکومت کے مقابلہ میں ایک صوبہ تک محدود رہنا پسند کرے گی۔؟ اس صورت میں کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ فراخدلی کے ساتھ اسے خود ہی ان نکات کی تشریح اور تفسیر میں نرمی برتنے کا موقع دیا جائے؟ کہتے ہیں مسٹر بھٹو نے یہ بھی کہا کہ ہمیں بعض نکات سے یقیناً اختلاف ہے اور اس اختلاف کا ہم برملا اظہار بھی کرتے ہیں لیکن چھ نکات کے خلاف کوئی ایجی ٹیشن شروع کر کے قوم کو یہ کہنے کا موقع نہیں دینا چاہتے کہ پیپلز پارٹی بنگال کی علیحدگی یا ناراضی کا سبب بنی ہے ہم آئین کے متعلق وضاحت کے ساتھ اپنا نقطۂ نظر پیش کریں گے اور اس پر بحث کا پورا موقع دیں گے۔ اگر ہماری بات نہ مانی گئی تو ہم اپنا پروگرام اور اپنی تجاویز لے کر عوام کے پاس چلے جائیں گے۔ چھ نکات عوام کے بنیادی مسائل کا حل نہیں

بھٹو صاحب نے یہ باتیں نہایت دردمندی کے ساتھ کہیں اور ساتھ ہی ان کے کارکنوں کے دلوں میں بیٹھ گئیں، کیونکہ پی پی آئی اور شر پسند اخبارات کی خبروں نے تمام کارکنوں کو ناراض کیا ہے۔ اس بار بھٹو صاحب اپنی پارٹی کی تنظیم کے متعلق بھی خاصے پریشان تھے اور اپنے کارکنوں سے انہیں بجا طور سے شکایت تھی کہ سارا بوجھ بھٹو صاحب کے کاندھوں پر ہی ڈال رکھا ہے۔ خود کوئی کام نہیں کرتے، چنانچہ اس جلسے میں ڈپٹی لیڈر بھی مقرر کئے گئے ہیں۔



وزیر علی صاحب (وسط میں ٹوپی پہنے ہوئے) ایک بستی کے لوگوں سے تعلیمی تجربے کے بارے میں مشورہ کر رہے ہیں۔

وزیر علی صاحب نے نادار بستیوں میں اسکول کھولے ہیں۔ وہ اس طرح کے اسکول سارے ملک میں کھولیں گے، جہاں بچّوں کو خواندگی کے علاوہ پیشہ ورانہ تربیت بھی دی جائے گی۔ یہ ہے کم خرچ میں کم وقت میں، بنیادی تعلیم کے فروغ کا ایک بالکل انوکھا تجربہ۔

ڈھول میں پھول

گندی گلیوں میں

اسکول

تعلیم کو نادار

گھروں میں

پہنچانے کا

ایک نیا تجربہ

نعیم آروی

نیشنل لٹریسی فونڈیشن کی خود کار اسکول تحریک کے بنیادی رکن مسٹر وزیر علی سیکریٹری مالیات اور ایکسپورٹ بورڈ کے چیئرمین رہ چکے ہیں۔ ۱۹۶۸ء میں وہ پاکستان اور فلپائن کی طرف سے ایشین بنک کے ایگزیکیٹو ڈائریکٹر منتخب کیے گئے۔ مختلف سرکاری و نیم سرکاری عہدوں پر رہتے ہوئے انہیں زندگی کی ساری سہولتیں میسّر تھیں، مگر ملازمت کے آخری دور میں انہیں اس بات کا شدّت سے احساس ہوا کہ ان کا ملک مسائل کی آگ میں جل رہا ہے۔ لوٹ مار کا بازار گرم ہے، عوام کے لئے زندگی میں کوئی دلکشی باقی نہیں رہی۔ کھانے پینے کی اشیاء سونے کے بھاؤ بک رہی تھی، ہر طرف ناخواندگی، افلاس، بھوک، بیماری، رقابتوں اور نفرتوں کا الاؤ دہک رہا تھا۔

"ایسی حالت میں باہر کے ملک میں ٹھہرنا اور اپنے ملک کے عوام سے دُور رہ کر آسودہ زندگی بسر کرنا میرے لئے ممکن نہ تھا۔ میرا ملک تباہی کی طرف بڑھ رہا تھا، حالات بد سے بدتر ہوتے جارہے تھے۔ اگر میرا ملک تباہ ہو گیا تو اس بڑے عہدے اور عیش و آرام سے کیا فائدہ۔ میں نے عملی طور پر عوام کے دُکھ درد میں شریک ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ ملازمت میں رہتے ہوئے میں عوام کی کوئی خدمت نہیں کر سکتا تھا، نہ ہی ان کے مسائل حل کرنے میں ان کی کوئی مدد کر سکتا تھا۔ ملازمت اس راہ میں بہت بڑی رکاوٹ تھی، چنانچہ میں نے اپنے عہدے سے مستعفی ہونے کا فیصلہ کیا۔ میرا یہ فیصلہ میری زندگی کا اہم ترین فیصلہ تھا، میرے سامنے بس ایک راستہ تھا، ملک کے بنیادی مسائل حل کرانے میں عوام کی مدد کروں۔ اس خیال کے تحت یکم جنوری ۱۹۷۰ء کو فلپائن سے کراچی روانہ ہو گیا۔"

یہ وزیر علی صاحب سے میری پہلی ملاقات تھی۔ بسلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے انہوں نے کہا "یہاں سے میری عملی عوامی زندگی کا آغاز ہوا۔ محنت کش اور غریب عوام کے بنیادی مسائل سے آگاہی حاصل کرنے کے لئے ضروری تھا کہ میں اُن میں گھُل مِل جاؤں، ان کے ساتھ اُٹھوں بیٹھوں، ان کے دُکھ درد میں شریک ہو جاؤں، بلکہ خود اُن کی زندگی کا ایک حصّہ بن جاؤں۔ اس کے لئے میں نے کراچی کا ایک علاقہ موسیٰ کالونی کا انتخاب کیا۔ موسیٰ کالونی جھگیوں کی بستی ہے۔ مٹّی اور کیچڑ سے بھری ہوئی چھوٹی چھوٹی تنگ گلیاں، وسائل سے محروم، ناآسودہ محنت کش طبقہ، جہالت، بے روزگاری، افلاس اور بیماری اس بستی کی مقدّر بن چکی ہے، جھگیوں کے اندر بھوک سے بلبلاتے ہوئے بچّے اور مٹّی میں کھیلنے والے زرد رو بنگالی لڑکے۔ اِس پس ماندہ کالونی کو دیکھ کر مجھے موجودہ سماجی نظام اور اس کی بے انصافیوں کا شدّت سے احساس ہوا۔ نجانے اس قسم کی کتنی بستیاں اس سرزمین پر پھیلی ہوں گی۔ میرا یہ خیال یقین بن گیا کہ ہمارے مسائل سوشلزم ہی سے حل ہوں گے۔ سوشلزم سیاسی آزادی اور سرگرمیوں کے بغیر نہیں آسکتا اور سوشلزم لانے کے لئے عوام کا پڑھا لکھا ہونا بہت ضروری ہے، علم کے بغیر بات نہیں بنے گی۔"

موسیٰ کالونی کے لئے میرے منصوبے کے چار حصّے تھے۔

(الف) دس سال کے بچّوں اور بالغوں کو مندرجہ ذیل مضامین پڑھانا۔

۱۔ اردو کی ابتدائی تعلیم، لکھنا پڑھنا سکھانا۔

۲۔ انگریزی کی ابتدائی تعلیم، انگریزی میں نام اور پتے لکھنے کی تربیت دینا۔

مزدور پیشہ آدمی دن بھر کی مشقت کے بعد اتنا تھک جاتا ہے کہ رات میں دو گھنٹے

۳۔ ابتدائی حساب کتاب،

۴۔ رسول اللہ صلعم کی حیات مبارک کے اہم واقعات۔

پاکستان کے اہم واقعات

حصہ دوم۔ بالغوں کو اسلام کی سادہ تعلیمات سے روشناس کرانا

حصہ سوم۔ بستی کے معاملات کو اسلام کی روشنی میں باہمی افہام و تفہیم کے ذریعہ حل کرنا۔

حصہ چہارم۔ قرب و جوار کی بستیوں سے اتحاد و تعاون کرانا اور ان بستیوں کے لئے بھی اس قسم کے پروگرام ترتیب دینا۔

میں نے امام مسجد سے اپنے منصوبے پر بات چیت کی۔ انہوں نے بسم اللہ کہا۔ ایک روز نماز فجر کے بعد میں نے بستی کے لوگوں کے سامنے اپنا پروگرام پیش کرتے ہوئے بتایا کہ میں صبح اور شام کے وقت ان کے بچوں اور ناخواندہ افراد کو تعلیم دینا چاہتا ہوں، اس سلسلے میں ان سے کوئی معاوضہ طلب نہ کیا جائے گا۔ بستی والے خوشی خوشی رضامند ہو گئے۔

جھگیوں کے وسط میں ایک چھوٹی سی مسجد تھی۔ میں نے اس کے ساتھ ہی بانس کے اوپر ٹین کی چادریں ڈال کر ایک اسکول قائم کر دیا۔ بستی والوں کے پاس اتنا پیسہ نہ تھا کہ وہ مالی امداد کرتے، مگر اسکول کی تعمیر میں انہوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ چھ ماہ کے اندر اندر اسکول میں زیر تعلیم بچوں نے پرائمری اسکول گریڈ ۲ کی اردو اور انگریزی کتابوں کو لکھنا پڑھنا سیکھ لیا ابتدائی حساب کتاب سے بھی واقف ہو گئے۔ انگریزی اور اردو میں اپنے نام اور پتے لکھنے لگے۔ بنگالی زبان کی تعلیم دینے لیئے اسی بستی سے ہائی اسکول کے ایک طالب علم کو جز وقتی طور پر ماسٹر رکھ لیا گیا۔ اسے ہر ماہ ۲۵ روپے دیئے جاتے تھے۔ میں نے انہیں پیشہ ورانہ تعلیم کی بھی ترغیب دی اور مشورہ بھی دیا۔ انہوں نے میری بات مان لی۔ اس سلسلے میں سلائی کی دو مشینیں حاصل کی گئیں۔ شروع میں بستی کے ۱۲ نوجوانوں نے اس کام میں دلچسپی لی۔ لیکن دو ماہ کے بعد ان میں سے صرف پانچ رہ گئے اور آخر یہ تعداد گھٹ کر ۲ رہ گئی۔ مگر یہ دو افراد اپنی پیشہ ورانہ تربیت مکمل کرنے کے بعد اس لائق ہو گئے تھے کہ وہ ٹیلرنگ کا کاروبار خود شروع کر سکتے تھے۔

نادار بستیوں میں تجربے

مسٹر وزیر علی نے بتایا کہ موسیٰ کالونی میں رہائش کے دوران کئی واقعات نے انہیں بے حد متاثر کیا۔ اکثر مسجد میں بیٹھ کر وہ رسول اللہ کی حیات طیبہ کے اہم واقعات بیان کرتے تھے۔ بستی والے ان سے سوالات بھی کرتے تھے، وہ لوگ بڑے غور سے ان کی باتیں سنتے تھے۔ اور وہ آخر میں وہ سب مل کر نعت رسول پڑھتے تھے۔ ایک دن میں انہیں بتا رہا تھا کہ چوری بہت بڑی لعنت ہے اور بدترین گناہوں میں سے ایک ہے۔ ان میں سے ایک نے اٹھ کر کہا کہ وہ پینے کا پانی چرایا کرتے تھے کیا اللہ انہیں سزا دے گا۔؟

ایک مرتبہ چند لوگ منی آڈر کی رسید لے کر آئے انہوں نے مشرقی پاکستان میں اپنے رشتہ داروں کو کچھ روپے منی آڈر کئے تھے، مگر روپے ان کے رشتہ داروں کو موصول نہ ہوئے میں نے ایک درخواست لکھ کر انہیں جی پی او بھیجا، مگر انہیں تسلی بخش جواب نہ دیا گیا بعد میں ان سے اس معاملے کی تحقیقات کرنے کا وعدہ کیا گیا۔ لیکن وعدہ پورا نہ کیا گیا اور نہ ہی ان کے روپے کا کوئی سراغ ملا۔

اکثر و بیشتر وہ اپنے بیمار بچوں کو میرے پاس لاتے تھے اور بڑی رقت آمیز لہجے میں مجھ سے اسپتال میں داخلے کی سفارش یا پھر دعا کرنے کے لئے کہتے تھے۔ میں ان کی دونوں خواہش پوری کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک شخص حادثہ میں بری طرح زخمی ہو گیا۔ اور اس کی دونوں ٹانگوں کی ہڈیاں ٹوٹ گئیں۔ وہ غریب دو ماہ تک اپنی جھگی میں پلاسٹر چڑھائے ہوئے پڑا رہا۔ خوش قسمتی سے اس کی دیکھ بھال کرنے والے موجود تھے۔ اگر اس کا کوئی نہ ہوتا تو اس کی خبر گیری کون کرتا اور اسے زندہ رہنے کے لئے دو وقت کی روٹی کہاں سے آتی۔؟

چھ ماہ تک اپنے پروگرام کے چاروں حصوں پر عمل کر کے میں نے جو کچھ حاصل کیا اس کے نچوڑ یہ ہیں۔

الف۔ نسل در نسل چلتی ہوئی غربت اور جہالت سے ان کے اندر آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کا جذبہ ماند پڑ گیا ہے۔ صبر اور قناعت پسندی کی تعلیم سے ان کی قوت محرکہ کمزور ہو گئی ہے تعلیم، وسائل اور سرمائے کی کمی کی وجہ سے وہ اپنے حالات سے انتہائی مایوس اور ناامید ہو چکے ہیں۔

گھر بھر کی کفالت کرنے والا شخص دن بھر کی جسمانی محنت کے بعد اتنا تھک جاتا ہے کہ رات کے وقت تعلیم حاصل کرنا اس کے اختیار سے باہر ہوتا ہے۔

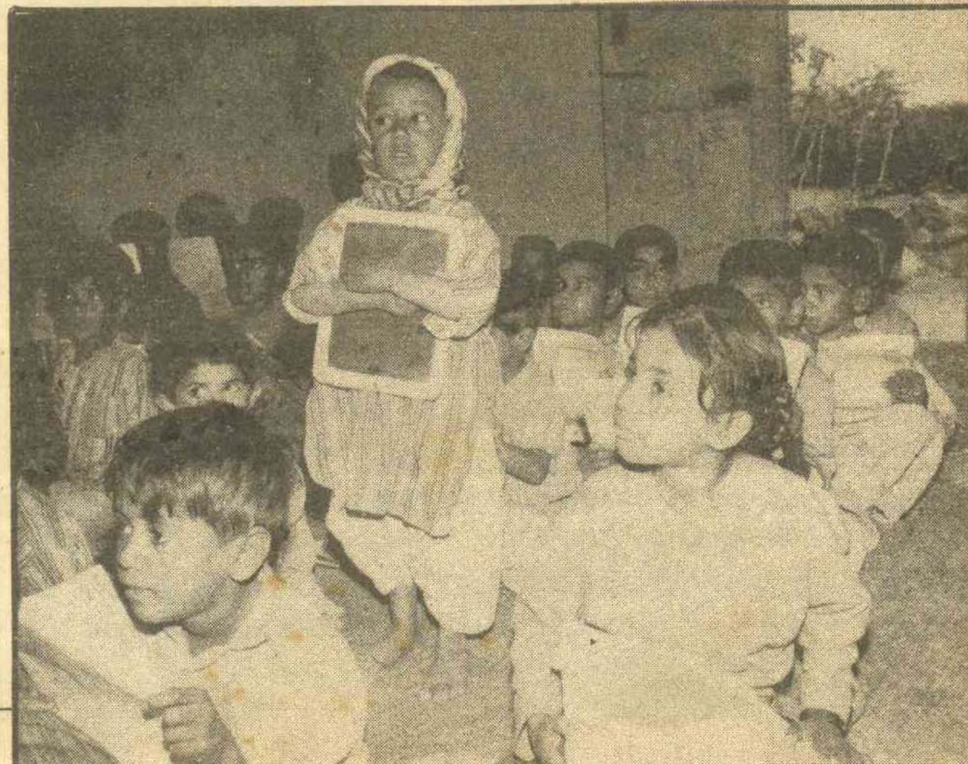
شہروں میں درمیانہ خوشحال طبقے اور تعلیم یافتہ افراد کو دیکھ کر وہ اس دھوکے میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ان کے بچے بھی پڑھ لکھ کر اچھی زندگی گذارنے کے لائق ہو جائیں گے۔

ان میں سے زیادہ تر لوگوں کے پاس اتنے وسائل نہیں ہوتے کہ وہ بچوں کی تعلیم کے اخراجات برداشت کر سکیں۔ وہ عام طور پر اتنے غریب ہوتے ہیں کہ ابتدائی تعلیم کی کتابیں بھی نہیں خرید سکتے۔

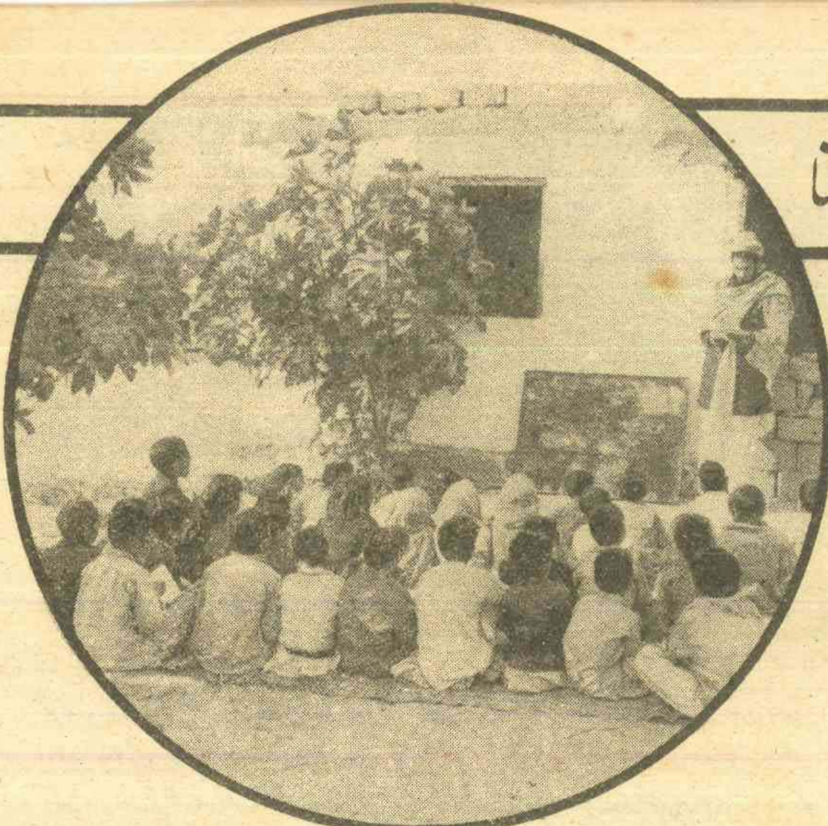
خرابی صحت کی بنا پر دو گھنٹے کی پڑھائی میں بھی ان کی دلچسپی قائم نہیں رہتی۔

یہ غریب لوگ اپنے بچوں کے مستقبل کے بارے میں کوئی منصوبہ بندی نہیں کرتے۔ ان کے پاس اتنے وسائل نہیں ہوتے کہ وہ اپنے بچوں کو ثانوی اسکول یا کسی پیشہ وارانہ سکول میں داخل کرا سکیں۔"

حکومت کی انتظامی مشنری سے اُن کا اعتماد اُٹھ گیا ہے کیونکہ پانی، بجلی، اسکول، پاسپورٹ اور منی آرڈر کی محفوظ ترسیل کی



بھی تعلیم حاصل نہیں کرسکتا



سہولتیں نہ ہونے سے انہیں بڑے تلخ حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

سیاسی لیڈروں کی وعدہ خلافی اور سرکاری کارندوں کی مسلسل دھونس اور دھاندلی کی وجہ سے اُن کی زندگی مایوسی اور ناامیدی کے عمیق سمندر میں ڈوب گئی ہے۔ انہوں نے اپنے موجودہ حالات کو مقدر کا فیصلہ سمجھ کر قبول کرلیا ہے۔ مگر نئی نسل حالات سے بدظن اور انقلابی تبدیلی کی خواہاں ہے۔ یہ نسل موجودہ سماجی نظام کو تبدیل کرنے کے لئے کسی بھی تشدد آمیز تحریک میں شامل ہوسکتی ہے۔

انہیں اسلام کی بڑی روایتی تعلیم دی گئی ہے، انہیں بس اتنا ہی بتایا گیا ہے کہ اسلام نماز، روزہ، اور حج کا نام ہے انہیں یہ نہیں بتایا گیا کہ اسلام مادی طور پر ایک خوشحال معاشرے کی ضرورت پر زور دیتا ہے۔ جس میں ہر شہری کے حقوق و فرائض یکساں اور مساوی ہوتے ہیں۔

سوشلزم کے لئے تعلیم ضروری ہے

قومی زندگی کے موجودہ نظام کو تبدیل کرنے کے لئے بنیادی اور انقلابی اقدامات کی ضرورت ہے۔ قومی وسائل صرف چند تعلیم یافتہ چالاک اور سرمایہ دار لوگوں کے ہاتھوں میں سمٹ کر نہیں رہنا چاہیئے۔ پاکستان کے ہر شہری کا اِن پر حق ہے۔ ہر شہری کو تعلیم، روزگار اور مناسب اجرت کی ضمانت ملنی چاہیئے تاکہ وہ معاشرے میں مساوی اور باعزت زندگی بسر کرسکے۔

عوام کی سیاسی، معاشی اور سماجی زندگی میں انقلابی تبدیلی لانے کی ذمہ داری تعلیم یافتہ افراد پر عائد ہوتی ہے۔ ہر سیاسی جماعت کا یہ مشترکہ فرض ہے کہ وہ ملک کی خواندگی کے تناسب میں اضافہ کرے اور ناخواندہ لوگوں کی تعلیم کا بندوبست کرے۔

مسٹر وزیر علی نے کہا کہ چھ ماہ کے عملی تجربے سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اِس ملک میں عام لوگوں کے سیاسی، معاشی اور سماجی حالات بہت خراب ہیں، وسائل پر سرمایہ دار طبقہ کا قبضہ ہے محنت کش طبقہ زندگی کی ہر سہولت سے محروم ہے، افلاس اور لاعلمی پورے معاشرے کو گھن کی طرح چاٹ رہی ہیں۔ تعلیم یافتہ اور آسودہ حال طبقے اپنے میں مگن ہیں۔ عام لوگ خصوصاً نئی نسل سماجی ڈھانچے میں بنیادی اور انقلابی تبدیلیوں کی ضرورت شدت سے محسوس کررہی ہے۔ بنیادی اور انقلابی تبدیلیاں سوشلزم کے ذریعہ ہی لائی جاسکتی ہیں۔ اور سوشلزم کو سمجھنے اور اس کے اصولوں کو قابلِ عمل بنانے کے لئے ضروری ہے کہ ہمارے معاشرے میں تعلیم عام ہو، معاشرے کے ہر فرد کو کم از کم بنیادی تعلیم فراہم کردی جائے۔ یہی خیال نیشنل لٹریسی فاؤنڈیشن کی خودکار اسکول تحریک کی صورت میں ظاہر ہوا۔

پاکستان کی تقریباً ۸۰ فیصد آبادی (یعنی دس کروڑ بچاس لاکھ شہری) ناخواندہ ہے، اس میں ۵ سے ۱۰ سال تک کی عمر کے تقریباً سوا کروڑ بچے بھی شامل ہیں، کیونکہ اِن کے لئے اسکول نہیں ہیں اور ہر سال، ناقص تعلیمی نظام کی بدولت ناخواندہ بچوں کی تعداد میں کم و بیش ۱۰ لاکھ بچوں کا اضافہ ہورہا ہے۔

مروجہ تعلیمی طریقۂ کار کے ۲۳ سالہ تجربے سے ثابت ہے اس زیادہ لاگت اور کم رفتار طریقۂ کار سے ملک کی ناخواندگی دُور نہیں ہوسکتی۔ مثلاً ۱۰ سال پیشتر پاکستان میں ۱۵ فیصد لوگ خواندہ تھے۔ ماہرین کا اندازہ ہے کہ آج غالباً ۱۴ فیصد لوگ خواندہ ہیں۔ گویا ۸۵ فیصد ناخواندہ لوگوں کو خواندہ بنانا تو ایک طرف رہا تعلیمی نظام آبادی میں نئے اضافے کو بھی نہیں سنبھال سکا۔ ضرورت ہے کہ سوچ بچار سے ایک ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جو قوم کو جلد از جلد خواندہ بنادے۔

نئے تعلیمی طریقۂ کار کو آزمانے کے لئے کچھ لوگ جو حکومت میں انتظامی امور کا وسیع تجربہ رکھتے تھے اور کچھ کاروباری لوگوں نے مل کر نیشنل لٹریسی فونڈیشن قائم کی تاکہ منظم کوشش کی جائے جو مثال بن سکے۔ نئے انتظامی طریقۂ کار کی خصوصیت یہ ہے:۔

۱۔ (الف) فاؤنڈیشن ایسے بچوں کو تعلیم دینے کی کوشش کرے گی جو وسائل نہ ہونے کے باوجود تعلیم حاصل کرنے کی آرزو رکھتے ہیں۔ یہ امداد اس طرح سے ہوگی کہ مقامی لوگ اسکول کے لئے مسجد یا مسجد کے علاوہ مناسب جگہ مہیا کریں۔

(ب) فونڈیشن باقاعدہ تنخواہ دار اُستاد مہیا کرے گی، اور اُنکی ہدایات اور نگرانی کرے گی، مقامی امام مسجد اگر پرائمری تعلیم دے سکیں تو انہیں تنخواہ دار اُستاد مقرر کیا جائے گا۔

(ج) بچوں سے فیس نہیں لی جائے گی۔

نئے تعلیمی طریقۂ کار کی خصوصیت

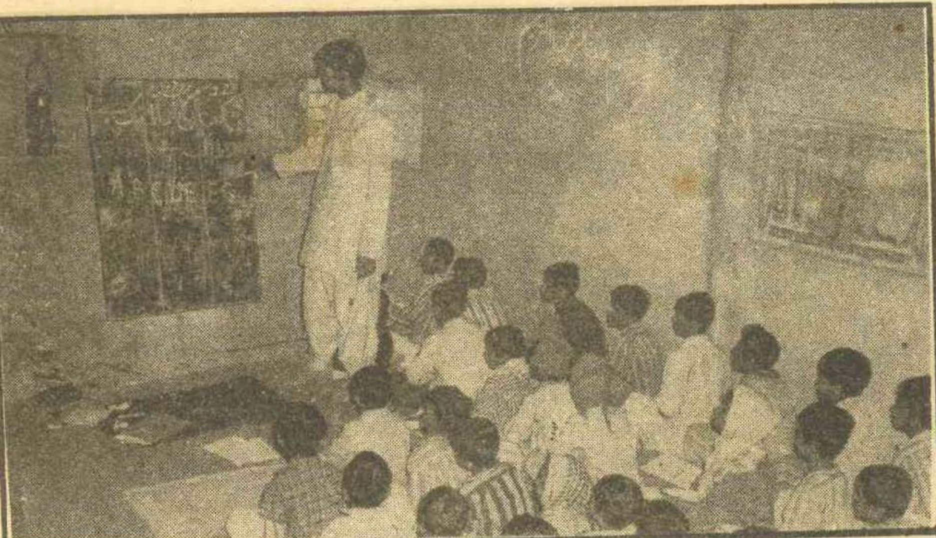
(الف) پرائمری اسکول کے موجودہ نصاب کے علاوہ بچوں کو انگریزی کی ابتدائی تعلیم بھی دی جائے گی۔ پڑھنے لکھنے اور حساب پر زیادہ توجہ دی جائے گی۔

(ب) بچوں کو دن میں صرف تین گھنٹے پڑھایا جائے گا۔ اس سے زیادہ پڑھائی سے بچے پورا فائدہ نہیں اُٹھاسکتے. یہ اسلئے بھی ضروری ہے کہ بچے دن کے باقی وقت میں اپنے ماں باپ کے کام کاج میں ان کا ہاتھ بٹاسکیں. اس طرح ایک اُستاد دن میں تین گھنٹے کے لئے چالیس چالیس بچوں کی دو جماعتوں کو پڑھا سکتا ہے۔

(ج) بچوں کو لمبی مدت کی چھٹیاں نہیں دیجائیں گی۔ اس طرح پرائمری اسکول کا نصاب جو پانچ سالوں میں ختم کیا جاتا ہے وہ چار سال میں پورا ہوجائے گا۔

(د) چوتھی جماعت کے بعد بچوں کو مقامی پیشوں کی مختصر تعلیم دینے کا انتظام کیا جائے گا مثلاً دھات کاری، لکڑی کا کام اور ٹیلرنگ وغیرہ۔

(ب) پرائمری اسکولوں کے لئے سادہ باتصویر رسالے مہیا کئے جائیں گے تاکہ مقامی لوگوں کے لئے بھی کارآمد اور دلچسپ ہوں اور اس سے فائدہ اُٹھاسکیں یہ اسکول چھوٹے بڑوں کے لئے لائبریری کا کام بھی دیں گے۔



ایک تجرباتی اسکول کا منظر۔ استاد بچوں کو انگریزی کا ابتدائی سبق دے رہا ہے

اس طریقۂ کار سے تقریباً ۲۵ روپے کے خرچ سے ایک بچے کو ایک سال کے لئے مفت تعلیم دی جا سکتی ہے۔ اور تقریباً ۱۴۰ روپے کے خرچ سے وہ پرائمری تعلیم کا کورس پورا کر سکتا ہے۔

الف۔ فونڈیشن ہر صوبے میں ایک ایک لٹریسی لیڈر مقرر کر رہی ہے، جو اپنی کوشش سے پچیس پچیس "خود کار اسکول" ضرورت مند علاقوں میں کھولیں گے۔

ب۔ ان اسکولوں سے حاصل کردہ تجربہ کی بنا پر اور سرمایہ کی حد تک ہر صوبہ میں مزید اسکول کھولے جائیں گے۔ اور ہر پچیس اسکولوں کے لئے ایک لٹریسی لیڈر مقرر کیا جائے گا۔

لٹریسی لیڈر کے فرائض

الف۔ لٹریسی لیڈر نئے طریقہ کار کا وسیع تجربہ رکھے گا، اس کی تنخواہ ---۷۰۰+۵۰+۰۰ لٹریسی فونڈیشن ادا کرے گی۔ وہ ضرورت مند علاقوں میں امام مسجد اور مقامی لوگوں سے صلاح و مشورہ کر کے خود کار اسکول قائم کریں گے۔

ب۔ لٹریسی لیڈر مقامی معاون لوگوں کے مشورہ سے استاد کے تقرر اور اسکول کی دیگر ضروریات کا انتظام کرینگے۔

پ۔ لٹریسی لیڈر استاد صاحبان کو نئے طریقہ کار کا "تعلیمی کٹ" پیش کریں گے جس میں نصاب اور طرز تعلیم کے متعلق ہدایات بھی شامل ہیں۔ استاد اور اسکول کو مقامی معاون لوگوں کو سپرد کر کے لیڈر اگلے اسکول کا رُخ کریں گے۔

ت۔ ابتدا میں لٹریسی لیڈر ہفتے میں ایک بار اسکول کا معائنہ کریں گے اور ہر تین ماہ بعد اسکول کا مفصل جائزہ لیں گے، تاکہ یقین ہو جائے کہ تعلیمی پروگرام ہدایات کے مطابق پورا ہو رہا ہے۔

ٹ۔ لٹریسی لیڈر ہفتہ میں ایک بار اپنی کارکردگی کی مختصر رپورٹ فونڈیشن کو بھیجیں گے۔ ساتھ ہی نئے استاد صاحبان کے منظوری فارم بھی بھیجیں گے۔

ج۔ لٹریسی لیڈر اپنے علاقہ کے محکمۂ تعلیم کے کارکنوں سے رابطہ رکھیں گے۔

فاؤنڈیشن کے چیف ایگزیکٹو کا کام

(الف) چیف ایگزیکٹو لٹریسی لیڈر صاحبان کا انتخاب کرے گا انہیں ابتدائی ہدایات دے گا۔ اور تمام اسکولوں کو ایک بار ضرور جا کر دیکھے گا۔ جب اسکولوں کی تعداد بڑھ جائے گی تو یہ کام ایک مشیر تعلیم کی امداد سے پورا کرے گا۔

(ب) چیف ایگزیکٹو تجربہ کار ماہرین تعلیم کی امداد سے خود کار پرائمری اسکولوں کے نصاب اور کتابوں کے متعلق ریسرچ کرائے گا۔ اور نئی کتابیں چھپوائے گا۔

(ج) چیف ایگزیکٹو لٹریسی لیڈر اور استاد صاحبان کے لئے ہر سال مختصر ٹریننگ کورس کا انتظام کرے گا۔

(د) چیف ایگزیکٹو متعلقہ ماہرین کے مشورہ سے خود کار اسکولوں میں ایسے ہنر سکھلانے کی تجویز تیار کرے گا جو بچوں کے لئے مقامی حالات میں نفع بخش ہوں۔

(س) یونیورسٹی اور کالجوں کے اساتذہ اور طلبہ میں "سپاہ علم" قائم کرنے کی کوشش کرے گا اور اس سپاہ کو خود کار اسکول قائم کرنے کی مہم پر لگائے گا۔

(ص) چیف ایگزیکٹو فاؤنڈیشن کے ممبروں کے علاوہ حکومت اور تعلیمی اداروں اور عوام کو فاؤنڈیشن کی کارکردگی سے مطلع رکھے گا۔ اور اس تحریک کو آگے بڑھانے کے لئے ان کی اعانت حاصل کرنے کی کوشش کریگا۔

اخراجات کہاں سے پورے ہوں گے؟

نیشنل لٹریسی فاؤنڈیشن کی خود کار اسکول تحریک کے اخراجات پورے کرنے کے لئے کم از کم چار سال کے لئے دس یونٹ ممبر پندرہ ہزار روپے دیں گے۔ پانچ یونٹ ممبر چار سال کے لئے، ہزار ۵۰۰ سو روپے دیں گے اور ایک یونٹ ممبر چار سال کے لئے ایک ہزار ۵۰۰ سو روپے دے گا۔ بنیادی ممبر کم از کم چار سال کے لئے ۳۰ ہزار روپے دے گا۔ نیشنل لٹریسی فونڈیشن کے ممبروں میں سید بابر علی، میاں محمد بشیر، مسٹر امیر علی ایچ فینسی، مسٹر حمی ایچ فینسی، مسٹر حسین ابراہیم، مسٹر رستم کاؤس جی، مسٹر رشید ڈی حبیب، لیفٹیننٹ جنرل ایم حبیب اللہ خاں، مسٹر عباس خلیلی، اور مسٹر ایم اے رنگون والا، شامل ہیں۔ مسٹر وزیر علی ممبر کے علاوہ اس فونڈیشن کے چیف ایگزیکٹو بھی ہیں۔

فونڈیشن اب تک کراچی میں ۱۹، حیدرآباد ۳۰، ملتان ۸ لاہور ۸ اور پشاور میں ۲ خود کار اسکول قائم کر چکی ہے۔ کراچی میں یہ خود کار اسکول، موسیٰ کالونی، علی محمد گوٹھ، کرنالی بستی، نشتر بستی، گوہر آباد، سعید آباد، المونیم کوارٹر جیسے پسماندہ علاقوں میں قائم کئے گئے ہیں۔

مسٹر وزیر علی نے بتایا کہ وہ اس نئے تعلیمی طریقۂ کار کا فارمولا حکومت کو پیش کر سکتے تھے مگر اس ڈر سے کہ کہیں یہ سُرخ فیتے کی نذر نہ ہو جائے انہوں نے اس پروگرام کو عملی طور پر ایک مثال بنانے کا فیصلہ کیا، تاکہ اس منصوبے کی کامیابی کے بعد حکومت اسے اپنانے میں پس و پیش نہ کر سکے۔ اور نہ نوکر شاہی اس کے آڑے آئے۔ انہوں نے کہا کہ تعلیم ہر شہری کا بنیادی حق ہے اور یہ حق بلا امتیاز ہر شخص کو ملنا چاہیئے۔ ہماری کامیابی یہی ہوگی کہ اس تحریک کے وسیلے سے ہر شہری کو بنیادی تعلیم ملنے لگے۔

مشرقی بنگال میں بائیں بازو کی تحریک : عبدالحمید خاں

گناشکتی گروپ مسلح انقلاب چاہتا ہے

کیا نکسل باڑی اصول یہاں قابلِ عمل ہے؟

آخر میں ہم بائیں بازو کے سب سے اہم مارکسی گروپ یعنی گناشکتی گروپ کے موقف پر غور کرتے ہیں، جس کے بنیادی خیالات کو اختصار کے ساتھ ذیل کے نکات میں بیان کیا جاسکتا ہے۔

(ا) طبقاتی جدوجہد کو بالخصوص دیہات میں تیز کیا جائے۔

(ب) انقلابی کسانوں کو گوریلا دستوں میں منظم کیا جائے تاکہ وہ طبقاتی دشمنوں اور حکومت کی مسلح طاقتوں کے خلاف اسلحہ بند ہوکر کارروائی کرسکیں۔

(ج) بورژوا جمہوری اداروں میں مثلاً انتخابات اور اسمبلیوں کی نمائندگی میں شرکت سے انکار کردیا جائے۔

(د) عوامی تنظیموں کی اہمیت ختم کردی جائے اور عوامی تنظیموں کے ذریعہ کام کرنے کا سلسلہ موقوف کردیا جائے، اس کی بجائے

(ہ) کسانوں اور مزدوروں میں خفیہ انقلابی مارکسی پارٹی کو پھیلایا جائے۔

یہاں یہ بات یاد رکھنا چاہیئے کہ گناشکتی گروپ کی پوزیشن تقریباً وہی ہے جو کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا (مارکسٹ لیننسٹ گروپ) کی ہے، جسے بالعموم نکسل باڑیوں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہاں یہ عجیب سی بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ زیادہ تر پیغ گروپ کو نکسل باڑیوں کے ساتھ ملایا جاتا ہے، حالانکہ وہ نکسل باڑیوں کے مسلّمہ اصول کے مطابق عوامی تنظیموں کے قیام کو مسترد نہیں کرتے اور نہ طبقاتی جدوجہد کے لئے عوامی تنظیموں کی ضرورت سے انکار کرتے ہیں۔

بائیں بازو کی مسلح جدوجہد، کوئی ایسا عمل نہیں، جو مشرقی بنگال کے لئے بالکل نیا ہو۔ کمیونسٹوں نے آزادی کے فوری بعد بائیں بازو کی انتہاپسندی کے زمانے میں بعض علاقوں میں مسلح جدوجہد کا طریقہ بھی آزمایا، لیکن پولیس نے فوج کی امداد کے بغیر ہی انھیں نہایت پھرتی سے پوری طرح کچل کر رکھ دیا۔

پڑوس کے ہندوستانی علاقے میں نکسل باڑیوں کی سرگرمیوں کی صورت کیا ہے؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس بارے میں مطلوبہ تفصیلات ہمیں موصول نہیں ہوتیں، بہرحال یہ بات تقریباً صاف ہوچکی ہے کہ نکسل باڑی اور سریکاکلم جیسی جگہوں کو آزاد کرنے کے بعد، ان کی آزادی کا عرصہ انتہائی مختصر گذرا۔ تحریک تو جاری ہے، لیکن اخباری اطلاعات سے جو یقیناً معاندانہ ہوتی ہے، جس حد تک اندازہ کیا جاسکتا ہے، وہ یہ ہے کہ ان کی کارروائیاں، وقت گذرنے کے ساتھ منظم گوریلا سرگرمیوں کی بجائے زیادہ سے زیادہ دہشت گردی کا رنگ اختیار کرتی جارہی ہیں۔ آئندہ حالات کیا رُخ اختیار کرتے ہیں، اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا تاکہ یہ تو معلوم ہو کہ یہ کارروائیاں واقعی وسیع پیمانے پر گوریلا تحریک کی صورت اختیار کرتی ہیں یا دھیرے دھیرے کرکے ختم ہوجاتی ہیں۔

مشرقی بنگال کا زرعی نظام

مشرقی بنگال میں، جن حالات کے تحت نکسل باڑی اصول اختیار کیا گیا ہے، وہ ہندوستان کے حالات سے یکسر مختلف ہیں۔ ہندوستان میں نکسل باڑی اصول اور کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا (مارکسسٹ لیننسٹ گروپ) کی تشکیل نکسل باڑی اور دوسری جگہوں پر مختلف کارروائیوں کے دوران میں ہوئی۔ یہ کارروائیاں ابتداً بے ساختہ انداز میں ہوئیں، البتہ بعد میں انھیں نظریات کے سانچے میں ڈھالا گیا۔ مشرقی بنگال میں مارکسی گروپ نکسل باڑی اصول پر برسوں سے جرح بحث اور ان کی تبلیغ کرتے آئے ہیں، لیکن بڑے گروپ (یا گروپوں) کے افکار و خیالات جب نکھر کر سامنے آئے تو اگرچہ اس کے بعد ایک سال سے بھی زیادہ مدت گذر گئی، تاہم اس اصول کے مطابق عملی کارروائی کے آثار نظر نہیں آئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا ایک بڑا سبب یہاں کے داخلی حالات میں مضمر ہے، اس کے علاوہ مارکسسٹوں کا اُس نسبت سے تیار نہ ہونا اور کسانوں کے انقلابی شعور کی سطح کا پست ہونا بھی اس کا سبب ہے۔ لیکن معلوم یہ ہوتا ہے کہ بعض نہایت اہم خارجی اسباب بھی اس صورتِ حال کے محرّک ہوں گے۔

کیا مشرقی بنگال میں چھوٹے قطعات کے مالک کسانوں کو پرولتاریہ میں شمار کیا جاسکتا ہے؟

دیہی طبقے:۔ ان حالات کا بنیادی سبب مشرقی بنگال میں زراعت کی مخصوص کیفیت ہے۔ کسانوں کی نسبتاً کم تعداد پرولتاریہ کی تعریف پر پوری اترتی ہے، جبکہ باجبروت قسم کے روایتی زمیندارے کے زمرے میں نہایت ہی کم لوگ آتے ہیں۔ یہ روایتی زمیندار طبقہ، جاگیردارانہ استبداد کی علامت ہوتا ہے، جسے ختم کرنے سے نادار کسانوں کی بھاری اکثریت کے حالات فوری طور پر بہتر ہوجاتے ہیں۔

یہ بات کسی قدر حیران کن ہے کہ اس گنجان آباد اور زمین کے معاملے میں مفلس ملک کے اندر دیہی محنت کشوں کی صرف ۱۰ فیصد تعداد، زمین سے یکسر محروم ہے اور کسانوں کی نہایت معمولی تعداد کو جو غالباً ۲ فیصد سے زیادہ نہ ہوگی اور کُل اراضی کے نہایت معمولی حصے کو بڑے مالکانہ یونٹوں (یوں کہہ لیجئے کہ ۲۰- ایکڑ سے زائد ملکیت) کے زمرے میں رکھا جاسکتا ہے۔ یہاں غالب اکثریت مالکانِ اراضی کی ہے، اگرچہ بسا اوقات ان کا ملکیتی رقبہ اتنا چھوٹا ہوتا ہے کہ وہ شدید افلاس میں مبتلا رہتے ہیں۔ تقریباً ۳۵ فیصد دیہی خاندان، ایک ایکڑ سے کم زمین کے مالک یا بالکل ہی زمین سے محروم ہیں۔

دیہی علاقوں میں گوریلا کارروائی کے ذریعہ طبقاتی جدوجہد کو تیز کرنے کا اصول، اس نظریے کی بنیاد پر قائم ہے کہ زمین پر نجی ملکیت کا حق منسوخ کردینا چاہیئے، کیونکہ طبقاتی دشمنوں کے استحصال کا خاتمہ، ان کی زمینیں چھین لینے کے بعد ہی ہوسکے گا۔ کیا کسی ایسے اصول کو چھوٹے، لیکن اراضی کے مالک کسانوں کی پُرجوش امداد حاصل ہوگی؟ گناشکتی گروپ کو صاف یقین ہے کہ اس سوال کا جواب اثبات میں ہوگا، چنانچہ اپنی تائید میں، وہ یہ صریح استدلال پیش کریں گے کہ اپنی مالکانہ حیثیت کے باوجود کسان یہ سمجھنے کی اہلیت بہرحال رکھتے ہیں کہ زمین کی تمام نجی ملکیتوں کو اور ان میں خود اُن کی زمینوں کے مالکانہ حقوق بھی شامل ہیں، ختم کرنے کے بعد ہی، اُن کے دردناک افلاس کا خاتمہ ہوسکتا ہے۔ اس مضمون کے راقم کی رائے میں، یہ قیاس کرنا غیرمعمولی سادگی کی بات ہوگی۔

خارجی حقائق:۔ ان نادار لیکن زمین کے مالک کسانوں کو، مارکسسٹ، کس طبقے میں شامل کریں گے۔ کلاسیکی

مارکسزم کو اس طرح کے مسئلہ کا سامنا کبھی نہیں ہوا۔ جائیداد کے مالک کسانوں کے بارے میں معلوم ہے کہ انھیں انقلاب کے ہراول دستے کی صفِ اوّل سے باہر رکھا جاتا ہے۔ بے زمین کسان، پرولتاریہ میں شامل کیے جاتے ہیں، کیونکہ موجودہ نظام میں، وہ ایسی کسی شئے کے مالک نہیں، جس کے چھن جانے کا خطرہ ہو، لہٰذا وہ انقلابیوں کی پہلی صف میں آتے ہیں۔

کیا مشرقی بنگال میں، نہایت مختصر قطعات کے مالک کسان یہاں کے چھوٹے "کلک" (انقلاب سے پہلے روس کے زمیندار) ہیں، یا انھیں مُفلس و نادار دیہی پرولتاریہ میں شمار کیا جائے گا؟ بظاہر نظر آتا ہے کہ یا تو دونوں میں سے ایک کا بھی اطلاق ان پر نہیں ہوتا یا دونوں صورتیں ان پر لاگو ہوتی ہیں۔ یہ بات کہ ان کے پاس کچھ زمین ہوتی ہے بجائے خود اس حقیقت کی غمّاز ہے کہ انقلابی جدوجہد میں ان کا کردار وہ نہیں ہوگا، جو پرولتاریہ کا ہوتا ہے جن کے پاس اپنی زنجیروں کے سوا کھونے کے لئے کچھ نہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ اتنے نادار ہیں کہ انقلابی جدوجہد میں ان کا ردِ عمل، خوش حال صاحبِ جائیداد طبقے کے لوگوں کی طرح نہیں ہو سکتا، جو موجودہ نظام کو ختم کرنے کی ہر کوشش کی سختی سے مزاحمت کرتے ہیں۔ یوں تو وسیع عملی تجربات کی بُنیاد پر ہی کوئی فیصلہ کُن تجزیہ مرتب کیا جا سکتا ہے تاہم اس بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ چھوٹے مالکانِ اراضی، ایک ایسی انقلابی جدوجہد میں پُرجوش ہراول دستے کا کام نہیں دے سکے، جس کے تحت زمین کی ملکیت ختم کرنی مقصود ہے۔ غالباً یہ تو ممکن ہو کہ ان میں بھی جو چھوٹے کسان ہیں (یعنی جس کے پاس ایک ایکڑ سے بھی کم اراضی ہے) وہ اچھی خاصی سیاسی تعلیم کے بعد اپنی ملکیت سے نیم دلی کے ساتھ دستکش ہونے کا فیصلہ کر لیں، لیکن جن کے پاس اس سے زیادہ زمین ہے، وہ غالباً ایسا نہ کریں، اور جو ان سے بھی بڑے ہیں، وہ یقیناً مزاحمت کریں گے۔

اراضی کے مالک کسانوں کا رویّہ

دوسرے ملکوں کے تجربے سے ظاہر ہے کہ زمین کی نجی ملکیت کے خاتمے کی مخالفت چھوٹے کسان بھی کرتے ہیں حتیٰ کہ نسبتاً زیادہ روایت پرست سوشلسٹ بھی جو زمین کو قومی ملکیت میں لینا نہیں چاہتے، یہ شکایت کر چکے ہیں کہ ایسے کسانوں کے طرزِ عمل میں دو رُخا پن ہوتا ہے۔ اس مضمون کے مصنّف کا خیال ہے کہ ایسے کسان معمول کے طور پر اپنی اراضی کے ملکیتی حقوق محفوظ رکھنا چاہیں گے (حتیٰ کہ نجی اراضی میں اضافے کی بھی کوشش کریں گے) باقی رہے وہ، جن کے پاس ایک ایکڑ سے زیادہ اراضی ہے، تو ان کی دو تہائی تعداد (اور آبادی کا اس سے بھی زیادہ تناسب)، غالباً یقینی طور پر زمین کی نجی ملکیت کے خاتمے کی مخالفت کرے گی۔

اس وضاحت سے کس طرح کا خاکہ مرتب ہوتا ہے؟ نکسل باڑی اُصول کے پُرجوش حامیوں کی تعداد، ان دس فیصد دیہی کنبوں سے کچھ زیادہ تجاوز نہیں کرے گی، جن کے پاس سرے سے کوئی زمین نہیں، اچھی خاصی سیاسی تربیت مہیّا کرنے کے بعد غالباً ایک ایکڑ سے کم ملکیتی رقبے کے مالک کسانوں سے یہ اُمید کی جائے گی کہ وہ انقلابی جدوجہد کو کس حد تک تعاون بہم پہنچائیں گے، اگرچہ یہ تعاون اتنا پُرجوش نہ ہوگا، جتنا پُرجوش تعاون، گوریلا جنگ لڑنے کیلئے ضروری ہے۔

دوسری طرف مشرقی بنگال میں، سب سے بڑے قطعات کے مالک زمینداروں کے درمیان بھی بمشکل کوئی ایسا ہوگا، جس کے معیارِ زندگی کو، روایتی ثروت مند جاگیرداروں کے رہن سہن سے دُور کی بھی کوئی نسبت ہوگی۔ وہ لوگ جو فرض کیجئے کہ دس ایکڑ کے مالک ہیں، یقیناً سماجی ترقّی کے مخالف ہیں کیونکہ سماجی تبدیلی کے عمل کو آگے بڑھنے سے روکنا چاہتے ہیں، لیکن ان کا معیارِ زندگی اتنا بلند یقیناً نہیں ہے کہ اس سے وسیع پیمانے پر طبقاتی منافرت پھیلنے کا امکان ہو۔ اس درجے کے طبقاتی دُشمنوں کو سامنے لانا اور بے زمین کسانوں کو یہ باور کرانا یقیناً آسان نہیں کہ اوّل الذکر کے خاتمے سے اکثریت کے لئے فوری طور پر بہتر زندگی کا امکان پیدا ہو جائے گا۔

یہ مسلّح انقلاب کس طرح کامیاب ہوگا؟

برِّصغیر میں، اپنے ہموطنوں کی روایت کے مطابق، مشرقی بنگال کے مارکسسٹوں نے بھی خارجی حالات کے تجزیے کی کچھ زیادہ کوشش نہیں کی۔ یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ اراضی کی تقسیم کی اس عجیب و غریب نوعیت کا انھیں احساس ہے۔ مارکسسٹ اپنی سیاسی تحریروں میں اکثر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ کسانوں کی ۸۰ فیصد یا اس سے زیادہ تعداد بالکل بے زمین ہے۔ یقیناً یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ انہوں نے اس بنیادی اطلاع کی توثیق کے لئے بھی کوئی کوشش کی ہے، یہ ایک نمایاں مثال ہے، شہری دانشوروں کی جو اس طرح کے کُلیّے نصب کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جنہیں کسی دوسری جگہ شدید تجربے اور تجزیے کے بعد قائم کیا گیا تھا، اور ایسا کرتے وقت یہ حضرات خارجی حالات کا اختلاف بھی سرے سے نظر انداز کر دیتے ہیں۔

یہ بات بھی غیر معمولی ہے کہ بائیں بازو کے مارکسسٹ مسلّح انقلاب کی باتیں کر رہے ہیں، اس سے پہلے انھوں نے ماضی میں انہی خطوط پر کی جانے والی کوششوں کے تجربات کا تجزیہ نہیں کیا۔ ۱۹۴۷ء اور اس کے بعد کے برسوں میں کیا غلطی سرزد ہوئی تھی؟ اس مقصد میں کامیابی آج کس طرح آسان ہو گئی ہے؟ اس دَوران میں اگر کچھ ہوا ہے تو یہ کہ ۱۹۵۰ء کے قانونِ مزارعت کی رو سے پہلے سے بھی زیادہ لوگوں کے درمیان زمین کے ملکیتی حقوق کی تقسیم کی بنا پر مارکسسٹوں کا کام مشکل تر ہو گیا ہے۔ اسی طرح حکمراں طبقوں کے استحکام اور فوجی اور سول انتظامیہ کی طاقت اور اقتدار کے اثرات ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ بائیں بازو کے مارکسسٹ ایک مکمّل اقتدار کا خاتمہ کس طرح کر سکتے ہیں، اگر اپنے دعوے کے مطابق انہوں نے مستقبل قریب میں ایسی کوئی مسلّح جنگ چھیڑی، جس طرح کی جنگ کی باتیں وہ بالعموم کرتے ہیں۔

پاکستان اور ویت نام کے حالات کا فرق

چین اور ویت نام میں بے زمین کسانوں کی تعداد کا تناسب مقابلتاً بہت ہی زیادہ تھا۔ جاگیرداری اقتدار اور استحصال کے مظاہر جنہیں پہچاننا بے حد آسان تھا، ان کے سامنے تھے، یہ چند جاگیردار تھے، جو نہ صرف یہ کہ وسیع قطعاتِ اراضی کے مالک تھے بلکہ انہیں کسانوں اور انکے کنبوں پر بھی نیم مالکانہ حقوق حاصل تھے۔ لہٰذا یہ ایک فطری امر تھا کہ کسانوں کی اکثریت، جدوجہد میں ایک انتہائی پُرجوش کردار ادا کرتی۔

مشرقی بنگال میں، اراضی کے مالک کسانوں کے اندر اس حد تک جوش پیدا کرنا کہ وہ ایک ایسے اُصول کی تائید میں مسلّح ہو کر اُٹھ کھڑے ہیں، جس کا مقصود، زمین کی نجی ملکیت کی تنسیخ ہے، ایک نہایت مُشکل کام ہے بلکہ بے زمین اور نادار کسانوں کو یہ باور کرانا ناممکن ہے کہ جاگیردارانہ اقتدار کے مظاہر ان کے درمیان موجود ہیں، جن کے ختم ہوتے ہی غالب اکثریت کی کایا پلٹ جائے گی۔ ممکن ہے، یہاں ۱۹۶۸ء ـ ۶۹ کے زبردست جوش و خروش کے دَور کا حوالہ دیا جائے۔ بعض علاقوں کے کسان یقیناً مسلّح ہو کر اُٹھے، لیکن جن لوگوں کے خلاف انہوں نے ہتھیار اُٹھائے، وہ "طبقاتی دُشمن" ہرگز نہ تھے بلکہ "سماجی دُشمن" تھے، مثلاً مویشی چور اور اُچکّے۔ اس کی توجیہہ محض اس طرح نہیں کی جا سکتی کہ ان میں تنظیم کی کمی ہے یا شعور کی کمی ہے۔ درحقیقت جاگیردارانہ نفع اندوزی، اتنی کھلی اور جارحانہ نہ تھی کہ اس سے شدید عوامی نفرت پیدا ہوتی۔

بایاں بازو اور قوم پرستی:۔ اس مضمون کا مصنّف یا تاثر پیدا کرنا نہیں چاہتا کہ اس کے خیال میں مشرقی بنگال کی زرعی صورتِ حال، ریاستی اقتدار پر قبضے کے لئے مسلّح جدوجہد کے تمام امکانات کی نفی کرتی ہے۔ لیکن یہ مقصد حاصل کرنے کے لئے عوام کو مروّجہ یا مضبوط طبقاتی نفرت کے مقابلے میں کہیں زیادہ قوتِ محرکہ درکار ہوگی۔

(باقی آئندہ)

مکتوبِ پشاور :- فارغ بخاری

پشاور میں قومی رہناؤں کی ملاقاتیں

آئین کی تشکیل میں ناکامی ایک قومی المیہ ہوگی

گذشتہ ہفتے سارے ملک کی نظریں صوبہ سرحد پر لگی رہیں یہ خطہ چند دنوں کے لئے ملک بھر کی سیاست کا محور بن گیا ہے پیپلز پارٹی کے رہنما کئی دفعہ سرحد کا دورہ کر چکے ہیں۔ لیکن اب کے ان کی آمد کی نوعیت اور اہمیت یوں بڑھ گئی ہے کہ انہوں نے آئینی بحران حل کرنے کے لئے مغربی پاکستان کے لیڈروں سے قومی اور آئینی مسائل پر مذاکرات کی جو مہم شروع ہے اس کا آخری اور فیصلہ کن سٹیشن صوبہ سرحد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۳ر جنوری کی صبح وہ پشاور کے ہوائی اڈہ پر اترے تو ان کے استقبال کے لئے پیپلز پارٹی کے علاوہ نیشنل عوامی پارٹی (ولی گروپ) جمیت العلماء (ہزاروی گروپ) اور پاکستان مسلم لیگ کے اراکین بھی بھاری تعداد میں موجود تھے جنہوں نے چیئرمین بھٹو کو پھولوں کے ہاروں سے لاد دیا اور بھٹو زندہ باد کے نعرے لگائے اخباری نمائندوں نے مسٹر بھٹو اور ان کے ساتھیوں مصطفےٰ کھر اور میر علی تالپور کو گھیر لیا لیکن ان سے کوئی بات نہ اگلوا سکے مسٹر بھٹو نے کہا میں ہوائی اڈے اور ریلوے اسٹیشن کے بیانات پر یقین نہیں رکھتا بہت جلد آپ سے پریس کانفرنس میں کھل کر باتیں ہوں گی ابھی ہمیں وہ کام کرنے دیجیئے جس کے لئے ہم آئے ہیں۔

چیئرمین بھٹو ٹھیک بارہ بجے اپنے ساتھیوں مسٹر کھر، تالپور اور شیر پاؤ کے ہمراہ عبدالقیوم خاں کی قیام گاہ پر پہنچے، قیوم خاں نے یوسف خٹک کے ہمراہ ان کا استقبال کیا اور انہیں مذاکرات کے لئے دوسری منزل پر لے گئے کچھ دیر بعد باقی حضرات نیچے آ گئے اور مسٹر بھٹو اور قیوم خاں ڈیڑھ گھنٹہ تک تخلیہ میں بات چیت کرتے رہے، گفتگو کے اختتام پر دونوں لیڈر مسکراتے ہوئے نیچے آئے لیکن اب بھی بھٹو یہ کہہ کر اخبار نویسوں کو غچہ دے گئے کہ یہ خان قیوم کا گھر ہے اور وہ ان سے بڑے ہیں اس لئے وہی ان سے بات کریں گے۔ خان قیوم نے کہا ان کی بات چیت خوشگوار ماحول میں ہوئی ہے جو اطمینان بخش ہے اب وہ اپنی پارٹی میٹنگ میں ان مذاکرات پر رائے لیں گے۔

پروگرام کے مطابق مسٹر بھٹو چار بجکر بیس منٹ پر جمعیت العلماء اسلام کے جنرل سکریٹری مولانا مفتی محمود صاحب سے ملاقات کرنے صاحبزادہ محمد ایوب خاں بنوری کی رہائشگاہ پر گئے مولانا ہزاروی اور مفتی صاحب نے ان کا استقبال کیا اور ان سے معانقہ کیا۔ اس بات چیت میں مسٹر بھٹو کے ساتھ مصطفےٰ کھر میر علی تالپور اور حیات خاں شیر پاؤ نے حصہ لیا جب کہ دوسری جانب سے مفتی محمود صاحب کے علاوہ غلام غوث ہزاروی اور مسٹر صفدر سلیمی ایڈوکیٹ موجود تھے۔ یہ نشست تقریباً ایک گھنٹہ تک جاری رہی مذاکرات کے اختتام پر مفتی صاحب اور مسٹر بھٹو ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے مسکراتے ہوئے بند کمرے سے برآمد ہوئے اس موقع پر مفتی صاحب نے بتایا کہ ان کی بات چیت توقع سے زیادہ کامیاب رہی ہے انہوں نے کہا ہم مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے لئے آئین بنانے میں قابلِ عمل اور دونوں حصوں کے لئے قابل قبول تجاویز پر بھی پوری طرح متفق ہیں۔

بھٹو، ولی خان ملاقات

۱۴ر فروری کو چیئرمین بھٹو نے نیشنل عوامی پارٹی کے صدر عبدالولی خاں سے تقریباً ڈھائی گھنٹے ملاقات کی یہ اس سلسلہ کی سب سے طویل ملاقات تھی اس کے ساتھ ہی صوبہ سرحد کے سیاسی رہناؤں سے مسٹر بھٹو کے مذاکرات مکمل ہو گئے نیپ کے سربراہ سے مسٹر بھٹو کی بات چیت تنہائی میں ہوئی اس میں کوئی دوسرا شخص شریک نہ تھا۔ ملاقات کے بعد ولی خاں نے کہا ہم نے خالصتاً قومی اندازِ فکر سے تبادلۂ خیال کیا ہے اور ہم ان مذاکرات سے پُرامید ہیں۔

عوامی حلقوں میں قیوم خاں اور مفتی محمود سے آئینی امور پر مسٹر بھٹو کی مفاہمت یقینی تھی اور مذاکرات کے بعد اس کی تصدیق بھی ہو گئی لیکن ولی خاں کے متعلق شکوک و شبہات پائے جاتے تھے۔ کہ وہ شاید ان مسائل پر مسٹر بھٹو سے متفق نہ ہوں۔ اب اگرچہ انہوں نے اپنی رائے کا واضح اظہار نہیں کیا لیکن پیپلز پارٹی کے رہنما کو انہوں نے مایوس بھی نہیں کیا۔ جہاں تک ولی خاں اور ان کی پارٹی کا تعلق ہے ولی خاں، عوامی لیگ کے چھ نکات کے متعلق اپنے ایک حالیہ بیان میں پہلے اظہار رائے کر چکے ہیں کہ وہ چار نکات سے کامل طور پر متفق ہیں اور باقی دو نکات میں وہ ترمیم کی ضرورت محسوس کرتے ہیں انہوں نے اپنے اس بیان میں ملک کے استحکام کو بہت ضروری قرار دیا ہے۔ اور آئین کو ملک کے دونوں حصوں کے لئے قابلِ قبول بننے کے امکانات کو ممکن العمل بتایا ہے۔ ولی خان کے بیانات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ملک کو موجودہ سیاسی بحران سے نکالنے کے لئے پوری نیک نیتی سے کوشاں ہیں وہ ملک کی دونوں اکثریتی پارٹیوں کی باہمی مفاہمت بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ ہر مخلص محبِ وطن اور درد دل رکھنے والے پاکستانی کی طرح وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ جلد از جلد اختیارات قوم کے منتخب نمائندوں کو منتقل کرنے کے لئے راہ ہموار کی جائے۔ اور تحریر و تقریر کے ذریعے دونوں اکثریتی پارٹیوں کے نمائندے کوئی ایسا رویہ اختیار نہ کریں جو ان میں اختلاف و انتشار کی خلیج حائل کرے اور سامراجی ایجنٹوں کی آئینی مہم کو ناکام بنانے اور مارشل لا نافذ رہنے کی سازشوں کے لئے تقویت اور کامیابی کا باعث ہو۔ کیونکہ یہ ایک ایسا المیہ ہوگا جو ملک میں ایک خونیں انقلاب کا پیش خیمہ بھی ثابت ہو سکتا ہے۔

دونوں حصوں کے لئے قابلِ قبول آئین تیار ہو سکتا ہے

فلور ملیں قومی ملکیت میں لی جائیں

صوبہ سرحد کے مزدور رہناؤں اور بائیں بازو کے سیاسی حلقوں نے حکومت پر زور دیا ہے کہ وہ فلور ملوں کے مالکان کی پیش کش قبول کرتے ہوئے مغربی پاکستان کی تمام فلور ملوں کو قومی ملکیت میں لے لے۔ انہوں نے کہا فلور ملوں کے مالک، خسارے کا ڈھونگ رچا کر آٹے کی قیمتوں میں اور اضافہ کرنا چاہتے ہیں اور ساتھ ہی معیاری آٹے کی فراہمی کے حکومتی اعلان سے بھی گلوخلاصی کے خواہاں ہیں۔ اس لئے ملوں سے دستبرداری کی دھمکی دے کر انہوں نے حکومت کو مرعوب کرنے کی نئی چال چلی ہے حکومت کو ان کے دھوکے میں نہیں آنا چاہیئے، ان کی پیش کش قبول کرتے ہوئے فلور ملوں کو قومیانے سے نہ صرف ان مل مالکان کی اجارہ داری ختم ہو گی بلکہ قومی خزانے کو کروڑوں روپے سالانہ منافع حاصل کرنے کا موقع ملے گا۔

سرمایہ داروں کی یہ منطق ناقابلِ فہم ہے کہ یوں تو وہ حکومت اور حکومت کے اہل کاروں کے گن گاتے نہیں تھکتے لیکن جہاں ملکی صنعتوں کو قومیانے کی بات چلے وہاں انہیں نااہل ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں اور بڑی

فریب کاری سے لوگوں کو یقین دلاتے ہیں کہ اگر خدا نخواستہ یہ صنعتیں حکومت کے کارندوں کے ہاتھوں میں چلی گئیں تو ملک میں قحط کے آثار نظر آئیں گے اور اب تو وہ نقصان کا رونا بھی رونے لگے ہیں اور کہتے ہیں ہمیں تو اس میں کوئی فائدہ ہی نہیں مفت کے جھمیلوں میں پھنسے ہوئے ہیں جتنا جلدی چھٹکارا ہو بہتر ہے لیکن حیرت ہے کہ اس خسارے کے کاروبار میں وہ ہر سال ایک نئی مل کھڑی کر دیتے ہیں۔ اور اس سے زیادہ حیرت اس بات پر ہے کہ جب یہ حضرات اس خسارے کے کاروبار سے اتنے ہی تنگ ہیں تو حکومت ان بیچاروں کو اس مصیبت سے نجات کیوں نہیں دلواتی ویسے انہیں مایوس نہیں ہونا چاہئے اگر حکومت نے توجہ نہ دی تو بہت جلد مزدور خود یہ فرض پورا کر کے ان کی دلی مراد بر لائیں گے۔

خیبر میڈیکل کالج کی ہڑتال

خیبر میڈیکل کالج کے طلبا کی ہڑتال نہایت خطرناک موڑ پر پہنچ چکی ہے صوبہ سرحد کے گورنر کے ایم اظہر خاں نے ہڑتالی طلبا کے وفد کو مشورہ دیا ہے کہ وہ ہڑتال ختم کر کے اصلاحات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے راہ ہموار کریں انہوں نے کہا موجودہ غیر معمولی حالات میں ان کی شکایات دور کرنے کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھایا جا سکتا۔ سننے میں آیا ہے کہ پشاور یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہاشم خاں نے خیبر میڈیکل کالج کے پرنسپل ڈاکٹر رضا کو بلا کر انہیں سبکدوش ہونے پر آمادہ کرنا چاہا لیکن ڈاکٹر صاحب نے یہاں بھی اسی سختی کا مظاہرہ کیا انہوں نے کہا وہ پرنسپل کے عہدے سے ہرگز دستبردار نہیں ہوں گے کیونکہ یہ ان کے وقار کا سوال ہے کہا جاتا ہے کہ انہوں نے طلبا کی ہڑتال اور مظاہروں کو وائس چانسلر کی کمزوری بتاتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ اگر وہ جرأت کر کے پندرہ بیس شرارت پسند لڑکوں کو گرفتار کرا دیں تو حالات معمول پر آ سکتے ہیں یہ باتیں طلبا تک پہنچیں تو وہ پرنسپل کو ہٹانے کے موقف پر اور زیادہ سختی سے ڈٹ گئے۔

ہڑتالی طلبا کے نمائندوں سے بات چیت کے دوران معلوم ہوا کہ وہ پرنسپل کو ہٹائے بغیر ہڑتال ختم کرنے کو اس لئے تیار نہیں کہ ڈاکٹر صاحب بقول ان کے بڑے ضدی اور منتقم مزاج انسان ہیں۔ انہوں نے اپنے حلقوں میں یہ بھی کہا ہے کہ اس سیشن میں ہی انہیں وہ مزہ چکھاؤں گا کہ زندگی بھر یاد رکھیں گے۔

گورنر صاحب نے جو یونیورسٹی کے چانسلر بھی ہیں طلبا کے وفد کو ہڑتال توڑنے کے لئے جس مناسب اور معقول طریقے پر سمجھانے کی کوشش کی شاید یہ کوشش بار آور ثابت ہو جاتی لیکن ڈاکٹر رضا صاحب کی ضد نے اس کوشش پر پانی پھیر دیا اور معاملہ پہلے سے کہیں زیادہ تشویشناک صورت اختیار کر گیا۔

مکتوب حیدرآباد : احمد الطاف

سندھیوں کا گھر گھر سندھ ھولوجی ہے

سندھی سندھ کی واحد سرکاری زبان ہے

حیدرآباد کنونشن میں مقرروں کا اعلان

سندھ میں لسانی مسئلہ کو بے وقت ہوا دیکر شر انگیزی پھیلانے میں حسب ذیل اغراض کار فرما ہوئے ہیں۔

۱ــ سوشلزم کے نام پر منتخب ہونے والی سیاسی جماعتوں کی انتخابی کامیابی کو ناکامی میں تبدیل کرنا۔

۲ــ سوشلزم کے حصول کے لئے جاگے ہوئے عوام میں تفرقہ پھیلانا اور محنت کش طبقوں، ہاریوں، مزدوروں کی معاشی جدوجہد کو سبوتاژ کرنا۔

۳ــ روز افزوں مہنگائی کی طرف سے غریبوں کی توجہ ہٹانا۔

۴ــ صوبائی خود مختاری کے مطالبہ کو پس پشت ڈالنا۔

۵ــ آئینی تعطل اور نظم و نسق کے بہانے دستور سازی میں رکاوٹ ڈالنا۔

۶ــ بحالیٔ جمہوریت کی پُرامن منتقلی کی راہ میں دشواری حائل کرنا۔

۷ــ متوقع زرعی اصلاحات کے نفاذ اور بڑی صنعتوں کو قومی تحویل میں لئے جانے سے روکنا۔

۸ــ نئے اور پرانے سندھیوں کے مابین نفاق کے زہریلے بیج بو کر باہمی بھائی چارے کو ختم کرانا تاکہ رجعت پسند اور شکست خوردہ عناصر اپنی کھوئی ہوئی سیاسی ساکھ بحال کر کے عیش کرتے رہیں اور مفلس و نادار عوام اسی طرح تباہ و برباد ہوتے رہیں۔

ان مذموم اغراض کے لئے رو بہ زوال سیاسی وڈیروں، غائب باش زمینداروں بوسیدہ نوابوں، نو دولتیے صنعتکاروں بلا تفریق لوٹ کھسوٹ کرنے والے سرمایہ داروں اور ان کے مفادات کی نگراں بیوروکریسی کے آلہ کار عناصر نے منفی عمل و مجنونانہ ردِ عمل پر مبنی عوام دشمن اور سندھ دشمن گٹھ جوڑ کر لیا ہے۔

سندھ میں علیحدگی پسند اور فرقہ وارانہ محاذوں کی بے لگام کارگزاری یہاں تک پہنچی کہ اس امن پرور صوبہ کا امن و امان تباہ ہوا۔ بھائیوں کو بھائیوں سے متنفر کر کے خانہ جنگی کی مہلک فضا پیدا کی گئی اور شہر و دیہات کا سکون غارت کیا گیا کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ آئندہ حالات کا رخ کیا ہو گا۔

اے ریگزارِ سندھ ترا چاند بجھ نہ جائے
آئے ہیں اس کی چاہ میں ارضِ دکن سے ہم
(حمایت علی شاعر)

سندھ میں لسانی سرگرمیوں سے متعلق تین واقعات خاصے اہم اور دور رس نتائج کے حامل ہیں، جو گذشتہ ہفتے رونما ہوئے۔

نوشہرو فیروز میں ۱۰ فروری کو "یوم سندھی بولی" منایا گیا اس میں دیہی عوام اور ہاریوں نے خاصی تعداد میں شرکت کی۔ سندھی اسٹوڈنٹس کلچرل آرگنائزیشن (SSCO) کے بانی اور پیپلز پارٹی کے ایک نوجوان رہنما مسٹر مسعود نبی نورانی نے جلسہ میں مفاد پرست سیاسی محاذوں اور ان کے چلانے والوں کو بے نقاب کرتے ہوئے کہا کہ انتخابات میں اپنی ضمانتیں تک ضبط کرا دینے والے، پیپلز پارٹی سے بدلہ لینے کیلئے تاریخ کے پہیئے کو پیچھے گھمانے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں اور وہ قدیم و جدید سندھیوں کو ہنگامی مسائل میں الجھا کر باہمی اخوت کو ختم کرنے کے درپے ہیں اور نت نئے فتنے اٹھا کر آئندہ قائم ہونے والی عوامی حکومت کے سماجی و اقتصادی منصوبوں کو ناکام کرنے کے لئے مسائل کا انبار لگا رہے ہیں لیکن انتخابات کے نتائج کی طرح ان کی یہ کوششیں بھی ناکام ہوں گی کیونکہ زبان کا مسئلہ کوئی لاینحل مسئلہ نہیں ہے۔ پیپلز پارٹی نے اس سلسلے میں ایک لسانی کمیٹی قائم کر دی ہے جس میں اردو اور سندھی دونوں مادری زبان بولنے والے شامل ہیں اور وہ جلد ہی ایک رپورٹ پیش کرے گی جس کی سفارشات کی روشنی میں لسانی مسئلہ خوشگوار انداز میں حل ہو کر ختم ہو جائے گا۔

جو محنت کشوں میں نفاق ڈالتے ہیں

سندھ این ایس ایف کے صدر نے اپنی تقریر میں کہا کہ مفاد پرست اور خود غرض لوگ آپ کو یہ کہہ کر بہکاتے ہیں کہ آپ کی غربت کے ذمہ دار شہر کے لوگ ہیں۔ دیہات کے کسانوں کا حق

کنونشن میں اردو کو ثانوی درجہ دینے کی شدید مخالفت کی گئی

شہر کے مزدوروں نے مار رکھا ہے۔ اس طرح وہ عوام کو آپس میں لڑا کرا پنا اُلّو سیدھا کرتے ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ آپ کا حق وڈیروں نے چھین رکھا ہے اور مزدوروں کو سرمایہ دار لوٹ رہا ہے اور لوٹنے والا طبقہ اپنی لوٹ کھسوٹ میں کوئی تفریق نہیں کرتا۔ اسی طرح آپ کو چاہیئے کہ نسل، مذہب اور زبان کی تمیز کئے بغیر دیہی اور شہری عوام، کسانوں، مزدوروں اور ترقی پسند طلبہ کا انقلابی اتحاد بنا کر اپنے مشترکہ دشمنوں کے خلاف قومی جمہوری تحریک کو تیز تر کریں۔

میرپورخاص میں ۱۲ فروری کو طلبہ نے "یوم سندھی زبان" منایا۔ اس موقع پر میر علی بخش خاں تالپور کے بنگلہ پر ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے سندھ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر مسٹر مہر حسین شاہ نے کہا کہ اس جلسہ کے انعقاد کے لئے ڈسٹرکٹ کونسل ہال کا پیشگی کرایہ ادا کر کے مقامی انتظامیہ سے اجازت لی جا چکی تھی لیکن ڈپٹی کمشنر نے

یوم سندھی زبان کے لئے جلسے کا اجازت نامہ، ڈپٹی کمشنر نے جلسے سے عین ایک دن پہلے منسوخ کردیا اور شہر میں منادی کرادی کہ اس جلسے کے لئے لاؤڈ سپیکر اور فرش وغیرہ مہیا نہ کئے جائیں۔

نہ صرف یہ کہ ایک دن پہلے اجازت منسوخ کر دی بلکہ جلسہ کے منتظمین کو دفتر میں بُلا کر تحکمانہ رویّہ اختیار کیا اور شہر میں منادی کر دی کہ اس جلسہ کے لئے لاؤڈ اسپیکر اور فرش وغیرہ بھی مُہیا نہ کئے جائیں۔ طالب علم رہنما نے اپنی تقریر میں کہا کہ مقامی سپرنٹنڈنٹ پولیس کا رویّہ اور بھی زیادہ قابلِ اعتراض ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ ہمیں معلوم ہے کہ اسی پولیس افسر کی رپورٹ پر ہمارے ایک اُردو بولنے والے رہنما حسن ناصر کو قلعہ لاہور میں شہید کیا گیا تھا۔ لیکن رجعت پسندوں کے آلۂ کار پولیس افسر کو یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ ایک دن محنت کش عوام اپنے لیڈر حسن ناصر شہید کے خون کا بدلہ لے کر رہیں گے۔

اس اجتماع سے جناب غلام محمد لغاری، میر تھیبو اور دیگر طالب علم رہنماؤں نے بھی خطاب کیا۔ انھوں نے فرقہ واریت اور نسطائیت کی مذمّت کی اور عوامی اتّحاد پر زور دیا۔

سندھی زبان کا کنونشن، حیدرآباد

کئی ماہ کی تیاریوں اور کثیر خرچ سے حیدرآباد میں ۱۴ فروری کو سندھ گیر پیمانے پر سندھی زبان کنونشن منعقد ہوا جس میں مختلف مکتبہ ہائے فکر کے سیاسی لیڈروں، قومی و صوبائی اسمبلی کے نومنتخب ارکان، سیاسی کارکنوں، سندھی زبان کے دانشوروں، ادیبوں، شاعروں، صحافیوں، اساتذہ، طلبا، وڈیروں، ہاریوں، فن کاروں، موسیقاروں، سرکاری و نیم سرکاری اداروں کے ملازموں کی خاصی تعداد کے علاوہ خواتین نے بھی شرکت کی۔

قومی و صوبائی اسمبلیوں کے جن ارکان میں سے پیر غلام رسول شاہ جیلانی، حاکم علی زرداری، ملک سکندر، الٰہی بخش بائہن، عبداللہ شاہ، حاجی صادق علی میمن، امداد علی شاہ، محمد خاں سومرو شریک ہوئے ان حضرات میں سے بیشتر کا تعلق پیپلز پارٹی سے ہے۔

باخبر ذرائع کے مطابق سندھی زبان کا کنونشن سندھ متحدہ محاذ کے بانی صدر جناب جی ایم سید کے ایماء پر ان کی حامی جئے سندھ اسٹوڈنٹس فیڈریشن ۱۱ فروری کو کرنے والی تھی جس کے لئے جناب حسام الدین راشدی زمین ہموار کر چکے تھے لیکن پیپلز پارٹی نے اپنی ایک معاون سیاسی تنظیم سندھ عوامی تحریک کے ذریعے جی ایم سید کے منصوبے کے بظاہر اتحادِ عمل کا واسطہ دے کر سبوتاژ کر دیا۔ اور ۱۴ فروری کو سندھ میں، پیپلز پارٹی اور سندھ متحدہ محاذ کے زیرِ اہتمام تین نشستوں پر مشتمل ایک مشترکہ کنونشن منعقد ہوا۔ کنونشن میں پیپلز پارٹی کا پلہ بھاری رہا جب کہ سندھ متحدہ محاذ اور اس کی معاون تنظیمیں انتخابی نتائج کی طرح اس موقع پر بھی ناکام رہیں اور پیپلز پارٹی اس بار بھی سبقت لے گئی۔

سندھی زبان کے کنونشن کا پہلا عام اجلاس جو مختلف تنظیموں کے نمائندوں کی تقاریر پر مشتمل تھا جامعہ عربیہ ہائی اسکول کی گراؤنڈ میں مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم کے ایک مقلد اور پیپلز پارٹی کے حامی مولانا عبدالحق ربانی کے زیرِ صدارت صبح ۱۱ بجے شروع ہوا۔ مہمان خصوصی جامعہ سندھ کی انسٹی ٹیوٹ آف سندھولوجی کے ڈائرکٹر مسٹر جی اے الانا تھے۔

تنظیمی کمیٹی کے کنوینر مسٹر لا لا عبدالقادر نے افتتاحی تقریر میں کنونشن کے انعقاد کی اہمیت اور سندھی زبان کی افادیت پر روشنی ڈالی۔ استقبالیہ کمیٹی کے چیئرمین مسٹر فاضل راہو نے ارکان اسمبلی مندوبین اور حاضرین کو "بھلی کری آیو" خوش آمدید کہا۔

ازاں بعد جئے سندھ اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر مسٹر اقبال ترین نے جوشیلی تقریر کرتے ہوئے سندھی کی مخالفت کرنے والے اُردو والوں کو متنبہ کیا کہ اگر وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے تو ان کا علاج کر دیا جائے گا اگر وہ اس سرزمین پر رہنا چاہتے ہیں تو بہتر ہوگا کہ وہ ثقافتی اقلیت کے حقوق پر اکتفا کریں۔

ہم انھیں گریبان سے پکڑ لیں گے

جئے سندھ نوجوان محاذ کے کنوینر مسٹر یوسف تالپور نے اپنی تقریر میں سندھ کے قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلی کے ممبران کو متنبہ کیا کہ اگر انہوں نے سندھ سے غداری کی اور صوبہ میں ایک کے بجائے دو زبانیں رائج کیں تو ہم انہیں گریبان سے پکڑ کر کھینچ لیں گے۔

سندھ ہاری کمیٹی کے جنرل سیکریٹری جناب غلام حسین سومرو نے ہاریوں کے ساتھ کی جانیوالی زیادتیوں اور سندھ کے ساتھ روا رکھی جانے والی ناانصافیوں کا ذکر کرتے ہوئے پرائمری ٹیچرز ایسوسی ایشن کے صدر مسٹر جان محمد جمالی نے کنونشن سے خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا کہ اگر سندھ میں سندھی کے علاوہ اردو کو نافذ کیا گیا تو اساتذہ اردو نہیں پڑھائیں گے۔

سندھی ادبی سنگت کراچی کے جنرل سیکرٹری مسٹر اقبال جتوئی نے اپنی تقریر میں سندھ کے ایک ترقی پسند گروہ کی مذمت کی جو صوبہ میں اردو کو ثانوی درجہ دینے کا حامی ہے۔ انہوں نے کہا کہ اردو کو ثانوی حیثیت بھی نہیں دینی چاہیئے۔ البتہ مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے کا حق اور دفاتر میں اردو میں درخواست وغیرہ دینے کی اجازت دی جاسکتی ہے۔

مس اختر بلوچ نے کنونشن کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ "گھر کی مالکن سندھی بولی ہے جو سہاگن اور رانی بنے گی۔ اس پر سوکن اردو برداشت نہیں کی جائے گی۔"

سندھی زبان و ادب کے ایک محترم بزرگ اور رائٹرز گلڈ کے رکن مولانا غلام محمد گرامی نے سندھی زبان کے علمی ادبی اور تاریخی پس منظر کی وضاحت کی اور اسے اپنے وطن یعنی سرزمین سندھ میں فوقیت دینے کا مطالبہ کیا۔

سندھ عوامی لیگ کے مسٹر حفیظ قریشی نے مختصر تقریر کرتے ہوئے سندھی زبان کی تحریک کو عوامی تحریک قرار دیا اور اکثر لوگوں کی توقع کے خلاف کوئی انتہا پسندانہ بات نہیں کی۔

نوجوان ہاری لیڈر جام ساقی نے سندھ میں سندھی کو آئین اور اردو کو ثانوی مرتبہ دینے پر زور دیا۔ انہوں نے آئین میں مکمل صوبائی خود مختاری اور حق خود ارادیت کی بنیاد پر آزادی کی حد تک علیحدگی کی شق شامل کرنے کا مطالبہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ صوبوں کی معاشی ترقی و خوشحالی کے لئے ضروری ہے کہ سرمایہ کی منتقلی کا آئینی تدارک کیا جائے جام ساقی نے لسانی فسادات کا ذمہ دار بیورو کریسی کو قرار دیا جو یہ چاہتی ہے کہ جمہور کو اقتدار کی منتقلی میں رخنہ پڑے اور ان کی نوکر شاہی برقرار رہے۔

یہ مسئلہ وڈیروں کا نہیں، ہاریوں کا ہے

نیپ کے لیڈر جناب غلام محمد لغاری نے کہا کہ سندھ سندھی زبان اور کلچر کو دیہی عوام نے بچایا ہے یہ ورثہ وڈیروں کا نہیں ہاریوں کا ہے اور اس کے تحفظ و بقا کی خاطر ہاریوں سے رابطہ قائم کر کے ان میں انقلابی شعور پیدا کر کے عوامی خوشحالی کی جدوجہد کو تیز کیا جائے۔

سندھ این ایس ایف کے صدر مسٹر مہر حسین شاہ نے کہا کہ زبان کا مسئلہ قومی حقوق کی جدوجہد کا ایک جزو ہے جیسے قومی حق خود ارادیت اور پاکستان میں پانچوں صوبوں کو مساوی بنیاد پر مکمل صوبائی خود مختاری کے حصول کی جدوجہد سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بات طے شدہ ہے کہ سندھی زبان کو پاکستان کی ایک صوبائی زبان اور سندھ کی واحد سرکاری زبان ہونا چاہیئے لیکن ہمیں یہ مطالبہ منفی انداز میں اٹھانے کے بجائے معاشی اور محنت کش عوام کے مطالبات کے ساتھ جوڑ کر مشترکہ جدوجہد کرنی چاہیئے کہ تاکہ استحصالی طبقہ کے خلاف عوامی تحریک میں فکر و عمل کی ہم آہنگی پیدا ہو۔ انہوں نے ہاری مزدور اور شاگرد عوامی رابطہ پر زور دیا کہ اس کے بغیر غاصب طبقہ کے خلاف موثر جدوجہد نہیں کی جا سکتی۔

قومی اسمبلی کے کارکن اور پیپلز پارٹی کے ایک رہنما پیر غلام رسول شاہ جیلانی نے سندھی زبان کی عظمت کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہم آپ لوگوں کو مایوس نہیں کریں گے،

مرکزی اسمبلی کے ممبر اور پیپلز پارٹی کے ایک لیڈر مسٹر حاکم علی زرداری نے جیجل سنتو سندھڑی ماں کے تقدس کا ذکر کرتے ہوئے کہا سندھی زبان سرزمین سندھ کی قدیم تاریخی زبان ہے اور ہم اپنی سرزمین اور زبان سے سدا پیار کرتے رہیں گے اور اس کی حق تلفی نہیں ہونے دیں گے۔ پیپلز پارٹی کے ایک اور لیڈر اور رکن قومی اسمبلی ملک سکندر نے اپنی تقریر میں کہا کہ سندھ سندھ کی واحد دریا ہے اور سندھی سندھ کی واحد بولی، ان میں کسی اور کی ملاوٹ یا شرکت، سندھ دشمنی کے مترادف ہو گی۔

صوبائی اسمبلی کے ایک رکن الہٰی بخش بابھن نے ادارہ سندھ لوجی کے نقصان کی تلافی کے لئے ۵ ہزار روپے سندھ لوجی کے نقصان کی تلافی کے لئے ۵ ہزار روپے کے عطیہ کا اعلان کیا۔ کنونشن میں ادارۂ سندھ لوجی کی امداد کے لئے ساڑھے بارہ ہزار روپے کے عطیات کا اعلان کیا گیا۔

کنونشن سے صوبائی اسمبلی کے ارکان عبداللہ شاہ، محمد خان سومرو اور بشیر احمد شاہ نے بھی خطاب کیا اور اعلان کیا کہ اگر سندھ میں سندھی کو واحد سرکاری زبان قرار نہیں دیا گیا تو وہ اسمبلی کی رکنیت سے مستعفی ہو جائیں گے۔

مہمان خصوصی مسٹر جی الانا نے کہا کہ علم و ادب کو جلا کر ختم نہیں کیا جا سکتا۔ سندھی زبان اور ہے۔ انسٹی ٹیوٹ آف سندھ لوجی کے ڈائرکٹر نے ادارہ میں مجرمانہ آتش زنی کرنے والوں کی مذمت کرتے ہوئے کہا کہ سندھ کے قدیم باشندوں کا گھر گھر سندھ لوجی ہے۔

آخر میں صدر جلسہ جناب مولانا عبدالحق ربانی نے کہا کہ وڈیرے سے لیڈر ہیں۔ ان پر بھروسہ عبث ہے۔ جب تک عوام متحد ہو کر آگے نہیں بڑھیں گے کچھ حاصل نہیں ہو گا انہوں نے کہا کہ مسائل پر کمیٹیاں بنانا رسم ہو گئی ہے اس طرح مسئلہ کو طول دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ انہوں نے پیپلز پارٹی پر بالواسطہ تنقید کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ وہ زبان کے بارے میں اپنے موقف کا مبہم نہیں واضح اعلان کرے۔

جو لوگ تشریف نہیں لائے

کنونشن کی دوسری نشست محفل مشاعرہ تھی جس کی صدارت سردیچ سجاولی نے کی اور مہمان خصوصی جناب امداد حسینی تھی جب کہ کنونشن کے پروگرام کے مطابق شیخ ایاز کو بطور مہمان خصوصی شریک ہونا تھا لیکن وہ سندھی زبان کے کنونشن میں شرکت کرنے کے بجائے عوامی لیگ کی مرکزی مجلس عاملہ میں شرکت کی غرض سے ڈھاکہ چلے گئے واضح رہے کہ کنونشن کی تنظیمی کمیٹی کے اعلان کے مطابق پہلے اجلاس میں جناب حسام الدین راشدی کو بطور مہمان خصوصی شریک ہونا تھا، لیکن بعض وجوہ کی بناء پر موصوف نے بھی عدم شرکت کو ترجیح دی۔ یہاں یہ بات بھی معنی خیز ہے کہ حیدرآباد میں رہتے ہوئے سندھی زبان کے ایک اور بڑے شاعر نیاز ہمایونی مشاعرہ میں بوجوہ شرکت نہیں کر سکے،

کنونشن کی تیسری نشست محفل موسیقی ایک عوامی موسیقار فقیر عبدالغفور کے زیر صدارت منعقد ہوئی جو رات گئے تک جاری رہی۔ اس آخری نشست میں مہمان خصوصی سندھ کی معروف گلوکارہ زرینہ بلوچ تھیں۔

کنونشن کی قراردادیں

۱ — سندھی زبان کو پاکستان کی ایک قومی زبان اور سندھ صوبہ کی واحد دفتری زبان تسلیم کیا جائے۔

۲ — غیر سندھی سول و فوجی حکام سے زمینیں لیکر بے زمین ہاریوں کو دی جائیں۔

۳ — جھوٹے کلیموں کے بارے میں مشرقی پاکستان ہائیکورٹ کے ججوں کی نگرانی میں تحقیقات کرا کے غائب باش زمینداری ختم کی جائے۔

۴ — کراچی اور حیدرآباد کے ٹیلیویژن اور ریڈیو اسٹیشنوں سے ۸۰ فیصد پروگرام سندھی میں نشر کئے جائیں۔

۵ — دنیا کے تمام ممالک کے ریڈیو اسٹیشنوں خصوصاً پیکنگ، ماسکو، بی بی سی۔ وائس آف امریکہ، تہران، انقرہ وغیرہ سے سندھی نشریات کی جائیں۔

۶ — کراچی یونیورسٹی سنڈیکیٹ اور تعلیمی بورڈ کراچی میں، سندھی مادری زبان والوں کو ۶۰ فیصد نمائندگی دی جائے۔

۷ — پی آئی اے، ریلوے، نیشنل شپنگ کارپوریشن، واپڈا، صنعتی ترقیاتی کارپوریشن، زرعی ترقیاتی کارپوریشن اور دیگر سرکاری و نیم سرکاری اداروں میں سندھی مادری زبان والوں کو مناسب نمائندگی دی جائے۔

۸ — سندھ رجمنٹ بنائی جائے۔

۹ — کراچی تا حیدرآباد نو تعمیر سپر ہائی وے کے کنارے صرف ٹھٹھہ اور دادو ضلعوں کے قدیم باشندوں کو زمینیں الاٹ کی جائیں۔

۱۰ — ملاکھڑو (سندھی کشتی) کو غیر ممالک میں روشناس کرایا جائے۔

کنونشن کے دوران میں ہزاروں کے اجتماع میں راقم الحروف (نمائندہ 'لیل و نہار' و 'آزاد') اور ایک پریس فوٹو گرافر کے سوا کوئی اور غیر سندھی نظر نہیں آیا۔ منتظمین نے قومی پریس خصوصاً اردو اخبارات کے نمائندوں کو مدعو کرنا ضروری نہیں سمجھا۔

(عوام کے وسیع تر مفاد کے پیش نظر اور فساد خلق کے ڈر سے، اکثر منفی اور مجنونانہ تقریروں کے اقتباسات، اس مکتوب میں شامل نہیں کئے گئے ہیں)

کلیم الحسن نقوی پرنٹر، انیس ہاشمی پبلشر انجمن پریس میں چھپا کر دفتر لیل و نہار عظمت منزل سنٹرل کمرشل ایریا پی ای سی ایچ ایس کراچی ۲۹ سے شائع ہوا۔

اُردو کا وہی انجام ہوگا جو دینِ الٰہی کا ہوا

(صفحہ ٦ سے آگے)

—— سنگرام

کی کوشش ہو رہی ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اُردو کس کی زبان ہے۔ اور کس کے مطالبات منظور کرنے کے لئے ہم نے اُردو کو قومی زبان کی حیثیت دی؟

شہنشاہ اکبر کے دور میں ہندی اور فارسی کو ملا کر پورے برصغیر کی فوجی زبان اُردو بنائی گئی تھی تاکہ اس کے فوجی (جن میں ہندو مسلمان اور دیگر قوموں کے لوگ شامل تھے) پورے ملک میں ایک ہی طرح کی زبان میں کام چلا سکیں صرف اس غرض سے یہ کھچڑی زبان بنائی گئی تھی، لیکن شہنشاہ اکبر کا عظیم بھارتی قومیت کا خواب جس طرح شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا تھا اس طرح آج اُردو بھی دم توڑتی نظر آتی ہے ہزاروں مردوں کا منہ دیکھنے والی کو جس طرح شوہر نصیب نہیں۔ ہوتا اسی طرح اُردو بھی کسی علاقے کی مادری زبان نہیں بن سکتی اردو آج سارے بھارت کی زبان ہوتے ہوئے کسی صوبے یا علاقہ کی زبان نہ ہونے کی وجہ سے آج وہاں سے بھی اسے دیس نکالا دیا جا رہا ہے۔

اکبر نے بھارت کے لئے جو کچھ بھی کیا ہو جس طرح دینِ الٰہی کی طرح اُردو زبان کو بھی اس نے جنم دیا اور تمام چیزوں سے قطع نظر اُردو میں کچھ نہ کچھ مسلمانی بو باس بھی موجود ہے۔ اس وجہ سے ہم نے بھی اُردو کو مغربی پاکستان کی زبان سمجھتے ہوئے قومی زبان کی حیثیت سے منظور کر لیا تھا، لیکن آج جب کہ مغربی پاکستان کے عوام ہی اُردو کو اپنی زبان تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ہم اسے کیوں تسلیم کریں؟ پھر کیا اُردو پاکستان سے بھی ختم ہو جائے گی؟

یہاں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ اکبر کی رائج کردہ پورے بھارت کی زبان اُردو کو اس کی اسلامی بو باس کی وجہ ہی سے آج بھارت سے تقریباً نکال دیا گیا ہے اور آج پاکستانی مسلمان ہونے کے باوجود اس زبان کو تسلیم کرنے سے مکر رہے ہیں۔ لہٰذا اب یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان میں اُردو کا مستقبل تابناک نہیں ہے۔ ہندی بھارت کی اقلیتی فرقے کی زبان ہونے کے باوجود قومی زبان بن گئی۔ لیکن اُردو کو یہ مقام نہ مل سکا۔ اس میں شک نہیں کہ قائدِ اعظم اور خواجہ ناظم الدین اردو کو پورے پاکستان کی زبان بنانے کی تگ و دو ہی کی وجہ سے ناکام رہے، اس کے بعد پاکستان کی تمام زبانوں کو ملا کر ایک قومی زبان بنانے کی بھی کوشش کی گئیں۔ لیکن چونکہ اس میں بھی اردو ہی کو بنیاد بنانے کی کوشیش کی گئیں تھیں اس لئے ملک کی اکثریت ان کوششوں کی حمایت نہیں کر سکی۔ بھارت کی طرح پاکستان میں بھی اب تک ایک قومی زبان کی تشکیل کی کوشیش جاری ہیں کیونکہ لسانی اختلافات قومی ترقی کی راہ میں سنگ گراں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔

اس مسئلے کا ہمارے سامنے ایک ہی حل ہے اور وہ یہ پاکستان کی اکثریت کی مادری زبان بنگلہ کو پورے پاکستان کی واحد قومی زبان کی حیثیت سے ترقی دینے کے منصوبے پر عمل درآمد کیا جائے کیونکہ پاک بنگلہ کے عوام میں بولی جانے والی زبان پاکستان کے دوسرے علاقوں میں بولی جانے والی زبان سے ملتی جلتی ہے اور پاکستان کے عوام علاقائی زبانوں کو ترقی دیتے ہوئے ہی قومی زبان کی حیثیت تسلیم کر سکتے ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ہماری قومی اسمبلی ہماری رائے کو سامنے رکھتے ہوئے اس مسئلے کا کوئی قابل قبول حل تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیگی اس ادارے کو پڑھ کر مغربی پاکستان میں اردو کے نادان دوست خاص طور پر وہ حضرات جو سندھ میں اردو سندھی جھگڑے میں اپنے آپ کی ملوث کر رہے ہیں۔ جماعت اسلامی کے رہنماؤں سے یہ سوال کریں گے کہ آخر اس دورخی پالیسی وضع کرنے میں اس وقت ان کے پیش نظر کیا مقاصد ہیں۔ یہ سوال یوں بھی جواب طلب ہے کہ سندھ میں لسانی اختلافات شدید ہو چکے ہیں اور بنگال میں ۲۱ فروری کی تاریخ قریب آ رہی ہے ایسے موقع پر سندھ میں جماعت اسلامی کی طرف سے اردو کی حمایت اور بنگال میں اردو کی مخالفت زبان حال سے کچھ اشارہ کر رہی ہے

HE LAILO-NAHAAR WEEKLY, KARACHI. R. L. No. S. 2744

28 - 2 - 1971

جوشؔ ملیح آبادی کی آپ بیتی

یادوں کی برات



یادوں کی بَرات ایک عظیم شاعر کے ستّر سال کے وسیع تجربوں کا خزینہ اور ایک تاریخ ساز عہد کی تہذیبی زندگی کا دلکش مرقّع ہے۔

۷۵۲ صفحات پر مُشتمل کتاب میں جوشؔ صاحب اُن کے عزیزوں اور دوستوں کی بیس تصویریں بھی شامل ہیں۔

قیمت مجلّد اعلیٰ ایڈیشن (مصوّر) ۳۰ روپے — غیر مجلّد (مصوّر) ۱۵ روپے

پاک پبلشرز لمیٹڈ۔ وکٹوریہ چیمبرس۔ وکٹوریہ روڈ کراچی ۳

766-E THAVER

Lailo Nahaar Newsweekly Registered as a Newspaper with the Post Office in United Kingdom.